اتّحادِ ملّت

مولانا وحیدالدین خاں

مولانا وحید الدّین خاں

مکتبہ الرسالہ ، نئی دہلی

فہرست

سالِ اشاعت : ۱۹۸۸ء ناشر : مکتبہ الرسالہ سی ۲۹ نظام الدین ویسٹ نئی دہلی ۱۱۰۰۱۳

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جب کوئی گروہ مل کر رہے اور اختلافات سے بچے تو اس کے بعد اس گروہ کے اندر جو اجتماعی حالت پیدا ہوتی ہے اسی کا نام اتحاد ہے۔ اتحاد کے لئے کچھ خرچ نہیں کرنا پڑتا، وہ اپنے آپ حاصل ہوتا ہے، اس کے باوجود اتحاد سب سے بڑی طاقت ہے۔

اتحاد کی کوئی مادی قیمت نہیں۔ تاہم ہر آدمی کو اس کی ایک قیمت دینی پڑتی ہے۔ یہ نفسیاتی قیمت ہے۔ اتحاد کسی گروہ کے اندر صرف اس وقت قائم ہوتا ہے جب کہ اس کے افراد اتحاد کی خاطر مطلوبہ نفسیاتی قیمت دینے کے لئے تیار ہو جائیں۔

یہ قیمت کیا ہے۔ یہ ذاتی بڑائی کی قربانی ہے۔ انسان کے اندر بڑا بننے کا جذبہ بے پناہ حد تک پایا جاتا ہے۔ یہی جذبہ اتحاد کے راستہ کی اصل رکاوٹ ہے اور یہی جذبہ وہ واحد چیز ہے جس کو قربان کرکے اتحاد قائم ہوتا ہے۔ جہاں ہر آدمی بڑا بننا چاہے وہاں اس کے نتیجہ میں جو چیز پیدا ہوتی ہے وہ انتشار ہے۔ اور جہاں لوگوں کا حال یہ ہو کہ وہ دوسرے کے مقام کو تسلیم کرتے ہوئے چھوٹا بننے پر راضی ہو جائیں وہاں اس کے بعد جو چیز وجود میں آتی ہے اسی کا نام اتحاد ہے۔

اپنے کو چھوٹا بنانا یا اپنے کو دوسرے درجہ پر رکھنا بظاہر مشکل کام ہے مگر جب یہ دیکھا جائے کہ یہ سارا کا سارا ذہنی معاملہ ہے تو اس سے زیادہ آسان اور کوئی چیز نہیں۔ اپنے کو بڑا بنا کر خوش ہونا یا اپنے کو چھوٹا بنتے دیکھ کر تکلیف محسوس کرنا دونوں ذہنی کیفیات ہیں۔ وہ ذہن کے اندر پیدا ہوتی ہیں اور ذہن کے اندر ہی انھیں ختم کیا جا سکتا ہے۔ آدمی اگر اپنے سوچنے کے زاویہ کو بدل دے تو ایک لمحہ میں وہ ایک ایسا سفر طے کر سکتا ہے جو اس کو اور اسی کے ساتھ پوری قوم کو کچھ سے کچھ بنا دے۔

اتحاد اس حکمت کا عملی نتیجہ ہے کہ اپنے سوا دوسرے کی بڑائی کو مان لیا جائے، خواہ یہ ماننا برنائے حقیقت ہو یا برنائے ضرورت۔ حضرت عمر فاروق کا حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کو مان لینا اسلامی تاریخ میں پہلی صورت کی مثال ہے اور حضرت حسن بن علی کا حضرت معاویہ کی خلافت پر راضی ہو جانا دوسری صورت کی مثال۔ ان دو چیزوں کے سوا اتحاد کی کوئی تیسری بنیاد نہیں۔

اتحاد قائم کرنے کے لئے بظاہر آدمی اپنی ذات کی قربانی دیتا ہے۔ مگر اپنی ذات کو کھو کر وہ زیادہ بہتر طور پر اپنی ذات کو حاصل کر لیتا ہے۔ اتحاد کے بغیر وہ صرف ایک شخص ہے۔ مگر اتحاد کے ساتھ وہ ایک پوری قوم بن جاتا ہے۔ اتحاد قوم کی طاقت ہے اور اسی کے ساتھ فرد کی طاقت بھی۔

سب سے بڑا اتحاد

میرے سامنے دیوار پر بیت اللہ کی تصویر ہے۔ وسیع مسجد کے درمیان کعبہ کی عمارت ہے اور اس کے چاروں طرف لاکھوں انسان گول دائرہ میں اپنے رب کے آگے جھکے ہوئے عبادت کر رہے ہیں۔ یہ سالانہ اجتماعی نماز ہے جو ہر بار حج کے مہینہ میں دنیا بھر کے ۲۵-۳۰ لاکھ مسلمان مکہ میں جمع ہو کر ادا کرتے ہیں اور جس کا فوٹو لیا جا سکتا ہے۔ لیکن تصور کی آنکھ سے دیکھئے تو یہی واقعہ اس سے زیادہ بڑے پیمانہ پر ہر روز پانچ بار ہوتا ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور اس طرح گویا ہر روز پانچ بار روئے زمین پر مسلمانوں کا گول دائرہ بنتا ہے۔ درمیان میں کعبہ ہوتا ہے اور ساری دنیا میں اس کے گرد دائرہ بنائے ہوئے مسلمان نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسی عظیم اور مکمل اجتماعیت ہے جس کی مثال کسی بھی دوسرے مذہبی یا غیر مذہبی گروہ کے یہاں نہیں ملتی۔

اس کے باوجود یہ عجیب بات ہے کہ مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جو آج ساری دنیا میں سب سے زیادہ غیر متحد ہیں۔ نہ کوئی دنیوی مقصد ان کو متحد کرنے میں کامیاب ثابت ہو رہا ہے اور نہ کوئی اخروی مقصد۔ اتحاد کے اتنے شاندار امکانات کے باوجود اختلاف کی ایسی بری مثال انسانی تاریخ میں دوسری نہیں ملے گی۔

لبیک اللھم لبیک

کعبہ

وہ مرکزی نقطہ جس کے گرد دنیا بھر کے خدا پرستوں کا عبادتی دائرہ قائم ہوتا ہے۔

اختلاف کی قاتل

دو آدمیوں میں اختلاف ہوا۔ اختلاف بڑھتا رہا، یہاں تک کہ دونوں ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔ پہلے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص دوسرا تھا اور دوسرے کے لئے زمین پر سب سے زیادہ قابل نفرت شخص پہلا۔

دونوں ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور نقصان پہنچانے میں لگ گئے۔ ہر ایک کے بس میں کہنے اور کرنے کی جو طاقت تھی وہ اس نے پوری طرح دوسرے کی کاٹ میں لگادی۔ دونوں اپنے تخریبی مشغلہ میں مصروف رہے۔ تاہم کوئی دوسرے کو مٹا نہ سکا یہاں تک کہ خود اس کے مٹنے کا وقت آگیا۔ آخرکار دونوں کے درمیان جس چیز نے فیصلہ کیا وہ موت تھی۔ موت نے ہر ایک کو اسی قبر میں پہنچا دیا جس میں وہ اپنے بھائی کو پہنچانے کا عزم کئے ہوئے تھا۔

موت کا یہ واقعہ ہر روز ہمارے سامنے پیش آتا ہے، ہر دن کوئی شخص جو دوسرے کو قبر کے گڑھے میں پہنچانا چاہتا تھا، خود قبر کے گڑھے میں پہنچ جاتا ہے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا۔ ہر آدمی یہ سمجھتا ہے کہ موت کا واقعہ اسی آدمی کے لئے ہے جس کے ساتھ وہ بظاہر پیش آیا ہے، خود اس کے اپنے لئے یہ واقعہ کبھی پیش نہیں آئے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ موت کی یاد ہر قسم کے اختلاف اور دشمنی کی قاتل ہے۔ موت آدمی کی ذات کو ختم کرتی ہے اور موت کی یاد آدمی کی برائیوں کو۔ مگر کوئی آدمی موت کو یاد نہیں کرتا۔ موت کا واقعہ کسی آدمی کے لئے اس کی برائیوں کو ختم کرنے کا سبب نہیں بنتا۔

حدیث میں ہے کہ موت کو خوب یاد کرو جو لذتوں کو ڈھا دینے والی ہے (اکثروا ذکر ھادم اللذات) کسی آدمی کے لئے سب سے بڑی لذت یہ ہے کہ وہ اپنے مخالف کو برباد ہوتا ہوا دیکھے۔ لیکن اگر آدمی موت کو یاد کرنے لگے تو اپنی بربادی کا اندیشہ اس سے دوسرے تمام احساسات کو اس طرح چھین لے گا کہ اس کو یاد بھی نہ رہے گا کہ اس کا کوئی مخالف ہے جس کی بربادی کا منصوبہ اسے بنانا چاہئے۔

ایسا انسان جو ہر لمحہ موت کی زد میں ہو وہ کسی دوسرے کو کیا نقصان پہنچا سکتا ہے۔ آدمی خود اپنی موت کے کنارے کھڑا ہوا ہے مگر وہ سمجھتا ہے کہ وہ دوسرے شخص کو اس کی موت کے کنارے پہنچا رہا ہے۔ نادانی کی یہ قسم بھی کیسی عجیب ہے۔

باہمی اختلاف

واطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم واصبروا ان اللہ مع الصّٰبرین (انفال ۴۶)

اے مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو ورنہ تمھارے اندر کمزوری آجائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

مسلمان اگر مل جل کر رہیں۔ وہ اللہ اور رسول کی مرکزیت کے گرد متحد رہیں تو وہ زبردست طاقت ہوتے ہیں۔ دیگر قوموں کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ان کے اکثر کام محض رعب و دبدبہ سے انجام پاتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ان میں آپس کا اختلاف پیدا ہوجائے تو دوسروں کی نظر میں ان کی ہوا اکھڑ جاتی ہے۔ ان کے دشمن ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے جری ہوجاتے ہیں۔

اتحاد و اتفاق کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ صبر ہے۔ کیوں کہ جب بھی بہت سے لوگ ایک ساتھ رہیں گے تو ان کے درمیان طرح طرح کی شکایتیں پیدا ہوں گی۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے گی۔ کبھی کسی کی تنقید پر کسی کو غصہ آئے گا، کبھی کسی کی ترقی سے کسی کے دل میں جلن پیدا ہوگی۔ کبھی لین دین میں ایک دوسرے کا مفاد ٹکرائے گا۔ کبھی ایک شخص کی امیدیں دوسرے سے پوری نہ ہوں گی اور اس کے جذبات کو ٹھیس لگے گی۔ اس طرح کے بہت سے اسباب ہیں جو لازماً پیدا ہوں گے۔ ان اسباب کی پیدائش کو روکنا ممکن نہیں ہے۔ ممکن صرف یہ ہے کہ آدمی ناخوش گواریوں کو سہے اور جب بھی اس قسم کی کوئی صورت پیش آئے تو اللہ کے لئے اس پر صبر کرلے۔ اختلاف کو برداشت کرنے کی زمین پر اتحاد وجود میں آتا ہے نہ کہ اختلاف کو ختم کرنے کی زمین پر۔ جو لوگ اختلاف اور شکایت کو برداشت کرکے متحد رہ سکیں وہی اپنے درمیان اتحاد قائم کرتے ہیں۔ زندگی کی بیشتر کامیابیوں کا راز صبر ہے اور اسی طرح اتحاد کا بھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اتحاد نام ہے اختلاف کے باوجود متحد رہنے کا۔ اگر یہ برداشت اور یہ وسعت ظرف نہ ہو تو اتحاد کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔

آج ہر طرف مسجدیں بھری ہیں۔ ہر جگہ بے شمار لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے باوجود مسلمان کیوں ذلیل ہورہے ہیں۔ مسلمانوں پر اللہ کی نصرت کیوں نازل نہیں ہوتی۔ اتنے بے شمار لوگ اللہ سے تعلق جوڑے ہوئے ہیں، پھر بھی اللہ ان کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے مسلمانوں کا باہمی اختلاف۔ خدا سے جڑنے کے لئے ہر آدمی مسجد کی طرف بھاگ رہا ہے مگر انسان سے جڑنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ انفرادی عبادت ہر ایک کررہا ہے۔ مگر اجتماعی عبادت جس کا دوسرا نام اتحاد ہے، اس میں اپنے کو شامل کرنے کی اہمیت کو کوئی نہیں جانتا۔

باعزت زندگی ایک ایک مسلمان کو الگ الگ نہیں مل سکتی۔ وہ جب بھی ملے گی پورے گروہ کو یکجائی طور پر

ملے گی۔ مسلمانوں کے لئے باعزت زندگی کا ملنا ایک اجتماعی واقعہ ہے۔ اس کے لئے اللہ کی اجتماعی مدد درکار ہے۔ اور اللہ کی سنت یہ ہے کہ اجتماعی مدد وہ ہمیشہ اجتماعی عمل پر نازل کرتا ہے۔ انفرادی عمل پر اجتماعی مدد کبھی نہیں آتی۔ آدمی نماز میں خدا سے "ملاقات" کر کے مسجد سے باہر آتا ہے تاکہ وہ بندوں سے "ملاقات" کرے۔ مگر وہ بندوں کی طرف سے منھ پھیر لیتا ہے۔ خدا سے جڑنے والا بندوں سے جڑنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اللہ سے جڑ کر بھی وہ اکیلا رہتا ہے۔ کروروں مسلمان روزانہ اللہ سے جڑ رہے ہیں مگر وہ آپس میں جڑ کر متحدہ ملت نہیں بنتے۔ حالاں کہ اللہ سے جڑنے کا تقاضا ہے کہ آدمی اللہ کے بندوں کے ساتھ جڑ جائے۔ اللہ سے "اتحاد" اور اللہ کو ماننے والوں سے "اختلاف" خدا کے غضب کو بھڑکانے والا عمل ہے نہ کہ خدا کی نصرت کو کھینچنے والا۔

جب ایسا ہو کہ لوگ اللہ سے جڑتے ہوئے نظر آتے ہوں مگر وہ بندوں کے ساتھ نہ جڑ رہے ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ وہ اللہ سے بھی جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ ظاہری عبادت کو دہرا رہے ہیں مگر عبادت کی حقیقت سے خالی ہیں۔ اللہ کے ساتھ جڑنا آدمی کے اندر تواضع پیدا کرتا ہے ایسا آدمی مسجد سے باہر انسانوں کے ساتھ انانیت اور سرکشی کا مظاہرہ کس طرح کرے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو حساب کے دن کی یاد دلاتا ہے پھر ایسا آدمی بندوں کے درمیان خدا کی پکڑ سے بے خوف ہو کر کس طرح رہے گا۔ اللہ سے جڑنا آدمی کے اندر خداوندی اوصاف پیدا کرتا ہے پھر وہ دوسروں کے اوپر مہربانی کرنے سے کیوں کر خالی ہو سکتا ہے جو اللہ کی سب سے بڑی صفت ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو ایک ایسی ہستی کا پڑوس عطا کرتا ہے جو تمام خوبیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے پھر ایسے آدمی سے دوسروں کو برائی کا تجربہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ اللہ سے جڑنا آدمی کو اس روز حساب کی یاد دلاتا ہے جب کہ ہر آدمی بے لاگ انصاف کے ترازو پر کھڑا کیا جائے گا۔ پھر وہ دوسرے انسانوں کے ساتھ بے انصافی کر کے یہ خطرہ کیسے مول لے سکتا ہے کہ قیامت کے دن وہ خدا کی پکڑ کی زد میں آجائے۔ اللہ سے جڑنا اس لئے ہوتا ہے کہ آدمی اللہ سے درخواست کرے کہ وہ اس کی غلطیوں سے درگزر فرمائے پھر جو آدمی خود اپنے لئے عفو و درگزر کی درخواست کر رہا ہے وہ دوسروں کے ساتھ سخت گیری کا رویہ کس طرح اختیار کر سکتا ہے۔ سورج کی دنیا میں رہنے والا کبھی تاریکی نہیں پھیلاتا پھولوں کے پڑوس میں رہنے والا کبھی بدبو نہیں بکھیرتا۔ یہی معاملہ بندۂ مومن کا ہے۔ مومن خدا اور فرشتوں کی صحبت میں اپنے روز و شب گزارتا ہے۔ پھر جو آدمی خدا اور فرشتوں کی صحبت میں رہے اس سے کسی کو ظلم اور بدخواہی کا تجربہ کیسے ہو سکتا ہے اور جس معاشرہ میں ظلم اور بدخواہی نہ ہو وہاں اختلاف کا کیا گزر۔

یہ اوصاف جب کسی کے اندر پیدا ہو جائیں تو اس کے اندر سے ان اوصاف کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو آدمی کو بندوں سے دور کرنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا خدا سے جڑنا لازماً بندوں سے جڑنا بن جاتا ہے۔ اور جب بندے باہم جڑ جائیں تو اللہ کو یہ منظر اتنا زیادہ پسند ہے کہ وہ کل صبح آنے والی بارش کو آج شام ہی ان پر برسا دیتا ہے، وہ کل کی نعمتوں کو آج ہی اپنے بندوں پر انڈیل دیتا ہے۔ اتحاد کسی گروہ کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اتحاد اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ اتحاد دنیا کی عزت بھی ہے اور اتحاد آخرت کی عزت بھی۔

اختلاف سے بچو

"اے مسلمانو! خدا سے ڈرو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو۔ اور اس میں متفرق نہ ہو۔ آپس میں اختلاف کرنا آگ کے کنارے کھڑا ہونا ہے۔ خدا کے نزدیک وہی لوگ کامیاب ہیں جو خصوصی اہتمام کے ذریعہ ہر حال میں اپنے اندر اتحاد و اتفاق کی فضا کو باقی رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے خداوندی علم کی امانت یہود کو دی گئی تھی۔ مگر وہ تفریق اور اختلاف میں پڑ گئے اور اس کے نتیجہ میں اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق بنا لیا۔ ان کے انجام سے ڈرو اور تم بھی انھیں کی طرح نہ ہو جاؤ۔" (آل عمران ۱۰۶ — ۱۰۲)

یہ تفریق و اختلاف جس سے بچنے کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے، اس کے بے شمار نقصانات ہیں۔ ان میں سے ایک وہ نقصان ہے جس کو قرآن کی سورہ نمبر ۸ میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

"اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو۔ آپس میں نزاع مت کرو۔ ورنہ تمھارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمھاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو۔ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" انفال — ۴۶

اتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اختلاف کی کوئی صورت پیدا نہ ہو۔ انسانوں کے درمیان اختلاف کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر جو لوگ خدا سے ڈرتے ہوں وہ معاملہ کی وضاحت کے بعد، یا تو اپنے اختلاف کو ختم کر دیتے ہیں اور اگر پھر بھی اختلاف باقی ہو تو وہ اس کو اپنے ذہن تک محدود رکھتے ہیں۔ عملی زندگی میں اس کو پھیلا کر معاشرہ کو خراب نہیں کرتے۔ اس کے برعکس جن کے دل خدا کے خوف سے خالی ہوں وہ اس کو اپنے عزت و وقار کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔ خواہ کتنے ہی دلائل دئے جائیں، وہ اپنی غلطی ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اختلاف رائے کو عناد کی حد تک جانے سے روکیں اور اس کو باہمی کدورت کا سبب بننے نہ دیں۔ یہی دوسری قسم کا اختلاف ہے جو قوم کو کمزور کر دیتا ہے۔

اب مسلمان آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو طاقت دوسروں کو مغلوب کرنے میں کام آتی وہ خود اپنے بھائیوں کو نیچا دکھانے میں برباد ہونے لگتی ہے۔ اس باہمی لڑائی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی دولت مسلمانوں کی جیب سے نکل کر غیر مسلموں کی جیب میں پہنچ جاتی ہے۔ ایک مسلمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ مسلمان جو اس کے مخالف بنے ہوئے ہیں وہ اس کا ساتھ دینے کے بجائے اس کی مصیبت پر اور خوش ہوتے ہیں حتیٰ کہ وہ اس کے دشمنوں سے مل جاتے ہیں، خواہ یہ دشمن غیر مسلم کیوں نہ ہو۔ نا اتفاقی کی بنا پر پیدا ہونے والی یہ چیزیں مسلمانوں کی مجموعی طاقت کو اس سے بہت کم کر دیتی ہیں جتنا کہ وہ حقیقۃً ہے۔

قولِ اسلام کا معیار اتحادِ اسلام ہے

یاایہاالذین آمنو الم تقولون مالا تفعلون۔
کبر مقتاً عند اللہ ان تقولوا مالا تفعلون ۔
ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا
کانھم بنیان مرصوص (الصف)

اے ایمان والو کیوں کہتے ہو منھ سے جو نہیں کرتے ۔
بڑی بیزاری ہے اللہ کے یہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو ۔
اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار
باندھ کر جیسے وہ دیوار ہیں سیسہ پلائی ہوئی۔

اس آیت کے مطابق قولِ اسلام کی صداقت کی جانچ اتحادِ اسلام ہے۔ اسلام کے قائلین اگر اسلامی مہم کے لئے متحد نہ ہو سکیں تو ان کا قول اللہ کی نظر میں مقت کبیر کی حیثیت رکھتا ہے جس کی کوئی قیمت نہ دنیا میں ہے اور نہ آخرت میں۔

یہ اصول نہایت اہم نکتہ پر مبنی ہے۔ کوئی بڑا کام اتحاد کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ مگر اتحاد ایک بہت بڑی قربانی مانگتا ہے۔ یہ آدمی کے "انا" کی قربانی ہے۔ جب زیادہ انسان ایک محاذ پر جمع ہوں گے تو لازمی ہے کہ ان میں رایوں کا اختلاف ہو۔ ایک کو دوسرے سے تکلیف پہنچے۔ بار بار نفس کو ٹھیس لگے۔ ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر یہ سویا ہوا جذبہ رکھتا ہے کہ "میری چلے، دوسرے کی نہ چلے"۔ ایسی حالت میں جب بھی کچھ لوگ جمع ہوں گے تو لازماً آپس میں ٹکراؤ ہوگا۔ کہیں خلاف مزاج بات کو برداشت کرنا ہوگا۔ کہیں تنقید سننی پڑے گی۔ کہیں اپنی شکست پر صبر کرنا ہوگا۔ کہیں اپنی بے عزتی کو سہنا ہوگا۔ کہیں اپنے مقابلہ میں دوسرے کو ترجیح دینی ہوگی۔ کہیں اجتماعی مصلحت کی خاطر اپنی ذاتی رائے کو قربان کرنا ہوگا۔ کہیں ایک جائز کریڈٹ سے محرومی پر اپنے کو راضی کرنا پڑے گا۔ غرض بے شمار قسم کی ناخوش گواریاں سامنے آئیں گی۔ ایسی حالت میں اتحادِ عمل پر وہی قائم رہ سکتا ہے جو اپنی "انا" کو ختم کر کے مسلمان بنا ہو۔ جو اپنی ذات کو دفن کر کے اجتماعیت میں شامل ہوا ہو۔ اس کے برعکس جو شخص اللہ کی کبریائی پر ایمان لانے کے باوجود اپنی انا کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہو وہ کبھی متحدہ جدوجہد پر ٹھیر نہیں سکتا۔ اللہ پر ایمان، اپنی حقیقت کے اعتبار سے، اپنی ذات کی نفی کا نام ہے۔ اور اتحاد میں سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ متحدہ جدوجہد سب سے بڑی اور یقینی کسوٹی ہے جس پر جانچ کر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ آدمی اپنی ذات کی نفی کر کے اسلام میں داخل ہوا ہے یا اپنی انا کے بت کو اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے۔ جو لوگ اپنی انا کے بت کو توڑ چکے ہوں ان کے لئے کوئی چیز اتحادِ عمل میں مانع نہیں ہوتی۔ اسی لئے اسلام کے محاذ پر جب ایسے لوگ قابلِ لحاظ تعداد میں جمع ہو جائیں تو لازماً وہ کامیاب ہو کر رہتے ہیں۔ آخرت کی جنت بھی ان کے لئے لکھ دی جاتی ہے اور دنیا کا غلبہ بھی (صف ۱۳) مگر جو لوگ اپنی انا کے بت کو لئے ہوئے ہوں، وہ کبھی متحدہ طاقت نہیں بنتے۔ اور اس طرح وہ ثابت کرتے ہیں کہ ان کا "قول" حقیقۃً قول بلا فعل تھا۔ ایسے لوگ اللہ کی نظر میں بالکل بے قیمت ہیں۔ خواہ اپنی خوش فہمیوں کی دنیا میں وہ کتنا ہی زیادہ بڑے نظر آتے ہوں۔ ایمان باعمل کی کسوٹی جو خدا نے مقرر کی ہے وہ اسلام کے لئے متحدہ عمل ہے۔ کوئی دوسری کسوٹی خواہ بظاہر کتنی ہی بڑی دکھائی دے خدا کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

امت مسلمہ کی طاقت: اتحاد

قرآن میں تکمیل دین کی آیت کے تحت ارشاد ہوا ہے ـــــ آج کفر کرنے والے لوگ تمھارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے، اب تم ان سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھ سے ڈرو (مائدہ ۳) یہ آیت حجۃ الوداع کے موقع پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ اس کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا۔ اس لحاظ سے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اور اصحاب رسول کی جدوجہد کے بعد اسلام کی تاریخ جہاں پہنچ چکی ہے وہ اتنی مضبوط ہے کہ اسلام اب اپنی ذاتی بنیادوں پر قائم ہو گیا ہے۔ اب اسلام بیرونی خطرات کی زد سے نکل گیا ہے، اب اس کے لئے خطرہ ہو سکتا ہے تو اندر کی طرف سے نہ کہ باہر کی طرف سے۔

مذکورہ آیت میں امت مسلمہ کے لئے اللہ کا یہ کھلا ہوا وعدہ ہے کہ اب اس کے لئے تشویش کی بات یہ نہیں ہے کہ اس کے اوپر اس کے دشمن غلبہ پالیں۔ بلکہ تشویش کی بات یہ ہے کہ امت کے افراد میں اللہ کا ڈر باقی نہ رہے۔ اب مسلمانوں کے لئے کمزوری کی بات خوف خدا کا نہ ہونا ہے نہ کہ کسی خارجی قوت کے مقابلہ میں ان کا کمزور ہونا۔ یہ اعتقادی بات نہیں ہے بلکہ وہ معلوم حقائق پر مبنی ہے۔ مسلمانوں کے معاملہ کو اللہ نے یہاں تک پہنچایا کہ زمین کے بڑے رقبہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ وہ اس اندیشہ سے باہر نکل گئے کہ محض تعداد کی کمی کی وجہ سے وہ کسی کے مقابلہ میں شکست کھا سکیں۔ ان کے پاس بہترین اقتصادی خطے ہیں۔ انتہائی اہم فوجی مقامات پر ان کا قبضہ ہے۔ ہر قسم کی صلاحیتوں والے افراد رات دن ان کے یہاں پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کو ایک ایسی کتاب حاصل ہے جو ان کو ساری دنیا میں فکری برتری عطا کر سکے۔ ان کی تاریخ اتنی شان دار ہے جو قیامت تک ان کی نسلوں کو جوش و ولولہ کی خوراک دینے کے لئے کافی ہے۔

جس قوم کے پاس برتری کے اتنے اسباب جمع ہو جائیں باہر کی کوئی قوم اس کو زیر کرنے کی ہمت نہیں کر سکتی، الا یہ کہ اس نے اپنی حماقت سے اپنے کو کمزور کر لیا ہو۔ اور یہ حماقت دراصل اندرونی اختلاف ہے قوم کے افراد جب اللہ سے ڈرنے والے ہوں تو وہ ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ وہ انصاف کے ساتھ ایک دوسرے کے حقوق ادا کرتے ہیں۔ پورا معاشرہ حسد اور بغض کی نفسیات سے پاک ہوتا ہے۔ اور جس معاشرہ کا یہ حال ہو اس میں باہمی اتحاد کے سوا کیا چیز جنم پائے گی۔ اس کے برعکس جب قوم کے افراد اللہ سے بے خوف ہو جائیں تو ہر ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جاتا ہے۔ ہر آدمی خود غرضی کے خول میں سمٹ جاتا ہے۔ بدخواہی، انتقام اور حسد سے پورا معاشرہ کھوکھلا ہو جاتا ہے ـــــ اللہ کا ڈر اتحاد کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب سے بڑی طاقت ہے۔ اللہ سے نڈر ہو جانا اختلاف پیدا کرتا ہے اور جو قوم باہمی اختلافات کی شکار ہو جائے وہ لازماً کمزور ہو جاتی ہے خواہ اس کی تعداد بظاہر کتنی ہی زیادہ ہو۔

دو مسلمان مل کر ایک کام شروع کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی وجہ سے دونوں میں اختلاف ہو جاتا ہے۔ اب اگر دونوں خاموشی سے اپنے کام کو الگ کر لیں اور اپنی کوششوں کو جاری رکھنے کے لئے الگ الگ میدان تلاش کر لیں تو اس سے معاشرہ میں کوئی خرابی یا کمزوری پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اگر ایسا ہو کہ ایک دوسرے کی کاٹ میں لگ جائے تو دونوں کے تعلقات میں فساد پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر معاشرہ کی کمزوری کا باعث ہوتا ہے۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے یہاں نکاح کا پیغام دیتا ہے۔ دوسرا مسلمان کسی وجہ سے پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ اب اگر پہلا مسلمان اس سے کوئی برا اثر نہ لے اور اپنے لئے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈ لے تو معاشرہ کسی خرابی کا شکار نہیں ہوتا، اس کے برعکس اگر پہلے مسلمان کے اندر دوسرے مسلمان کے خلاف دشمنی کی آگ بھڑک اٹھے۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے مقدمے قائم کرے اور اس کی بربادی کے منصوبے بنائے تو دو مسلمان خاندان نامعلوم مدت کے لئے ایک دوسرے سے کٹ جائیں گے اور نتیجۃً پورے معاشرہ میں بگاڑ پھیل جائے گا۔ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کی عمارت میں کرایہ دار ہے۔ مالک مکان کو کرایہ دار سے کوئی شکایت ہو گئی۔ اب اگر مالک مکان وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کرے تو دونوں کے تعلقات میں کوئی بگاڑ نہیں آئے گا اور ملت کا اتحاد قائم رہے گا۔ اس کے برعکس اگر مالک مکان یہ کرے کہ کرایہ دار کو اکھاڑنے کے لئے اس کو بدنام کرے۔ اس کے خلاف تخریبی منصوبے بنائے۔ اس کو ذلیل کرنے کی کوشش کرے تو یہ ملت کے قلعہ میں نقب لگانے کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ کچھ لوگ کرایہ دار کا ساتھ دیں گے اور کچھ لوگ مالک مکان کا۔ ملت دو جتھوں میں بٹ جائے گی۔ ملت کی جو طاقت ملت کی ترقی و استحکام میں لگتی وہ ملت کی بربادی میں صرف ہونے لگے گی۔

یہ چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح ملت کے افراد ایک رویہ اختیار کر کے اپنے کو طاقت ور بناتے ہیں اور دوسرا رویہ اختیار کر کے اپنے کو اور بالآخر پوری ملت کو کمزور کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس قسم کی تمام کمزوریوں کی واحد وجہ اللہ کی پکڑ سے بے خوف ہونا ہے۔ اگر آدمی اللہ سے ڈرے تو وہ ایسے الفاظ اپنی زبان سے نہیں نکالے گا جو اللہ کے یہاں بے قیمت ہو جانے والے ہیں۔ وہ ایسے عمل نہیں کرے گا جو اللہ کی میزان میں جرم ثابت ہونے والے ہیں۔ ہر آدمی اپنی غلطی کو تسلیم کرے گا۔ ہر آدمی دوسرے کو تکلیف دینے سے بچے گا اور جس معاشرہ میں یہ فضا ہو وہاں لازماً اتحاد فروغ پاتا ہے اور اتحاد ہی کا دوسرا نام طاقت ہے۔

آدمی دوسرے کی بربادی کے منصوبے بناتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اس سے پہلے کہ دوسرے کے خلاف اس کے ارادے پورے ہوں خود اس کی موت کا وقت آجائے گا۔ وہ دنیا سے اٹھا کر آخرت میں پہنچا دیا جائے گا۔ وہاں اس کو جواب دینا ہوگا کہ خدا نے اس کو جو کچھ دیا تھا وہ خدا کی امانت تھا۔ اس کو کیا حق تھا کہ ان کو خدا کے بندوں کی بربادی کے لئے استعمال کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی اگر صرف موت کو یاد رکھے تو وہ اس کی اصلاح کے لئے کافی ہو۔

خدا کی مدد اٹھ جاتی ہے

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں دو شریکوں کے ساتھ تیسرا ہوتا ہوں جب تک کہ ان میں کا ایک ساتھی اپنے دوسرے ساتھی کے ساتھ خیانت نہ کرے (قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللہ عز وجل: انا ثالث الشریکین مالم یخن احدھما صاحبہ)

مطلب یہ ہے کہ کوئی گروہ اسی وقت تک خدا کی مدد کا مستحق رہتا ہے جب تک اس کے افراد باہم ایک دوسرے کے خیرخواہ ہوں۔ اس کے برعکس جب وہ ایک دوسرے کے بدخواہ بن جائیں، جب ان کے درمیان خیانت کی فضا پیدا ہوجائے تو خدا کی مدد ان سے اٹھ جاتی ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا سے تعلق کا معیار بندوں سے تعلق ہے۔ اگر خدا کے ساتھ کسی کا تعلق درست ہے تو لازماً بندوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست ہوگا۔ جس کا تعلق بندوں کے ساتھ درست نہ ہو، سمجھنا چاہئے کہ خدا کے ساتھ بھی اس کا تعلق درست نہیں۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی زیادہ خدا کی باتیں کرتا ہو۔

خیانت کا اصل مفہوم اعتماد میں پورا نہ اترنا ہے۔ مثلاً عربی میں کہتے ہیں خانہ سیفہ (تلوار اچٹ گئی) یعنی تلوار مارنے سے جو امید کی تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ اسی سے مذکورہ حدیث کا مطلب سمجھا جا سکتا ہے۔

جب بھی دو آدمی ملتے ہیں، خواہ وہ مالک اور ملازم کی حیثیت سے ملیں یا تاجر اور گاہک کی حیثیت سے۔ وہ مالک مکان اور کرایہ دار کی حیثیت سے ملیں یا دوست اور معاون کی حیثیت سے۔ خواہ جس حیثیت سے بھی ایک شخص کا ساتھ دوسرے شخص سے پڑے، دونوں ایک خاموش عہد میں بندھ جاتے ہیں۔ ہر ایک کا دوسرے کے اوپر کچھ حق قائم ہوجاتا ہے۔ یہ حقوق اور ذمہ داریاں خواہ وہ لکھی ہوئی ہوں یا بغیر لکھی ہوئی، ہر حال میں ان کی پابندی ضروری ہے۔ ان حقوق اور ذمہ داریوں کو نبھانے کا نام امانت ہے اور ان کو نہ نبھانے کا نام خیانت۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی اس قسم کی خیانت کی جائے گی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہاں نفرت، بے اعتمادی، ایک دوسرے کی کاٹ اور تخریبی کارروائیاں جنم لیں گی۔ وہاں ہر طرف منفی نفسیات کی فضا پیدا ہوگی اور جہاں منفی نفسیات کی فضا ہو وہاں صرف شیطان کا راج ہوتا ہے۔ خدا اور اس کے فرشتے ایسی فضا میں کبھی بسیرا نہیں لیتے۔

مسلمان آپس میں کیسے رہیں

حدثنا عبد اللہ بن مسلمۃ عن مالک عن ابن شہاب عن انس بن مالک ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا، وکونوا عباد اللہ اخوانا، ولا یحل لمسلم ان یھجر اخاہ فوق ثلاث لیال (رواہ ابوداؤد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آپس میں ایک دوسرے سے بغض نہ کرو۔ ایک دوسرے سے حسد نہ کرو۔ ایک دوسرے سے پیٹھ نہ پھیرو۔ سب اللہ کے بندے بھائی بھائی بن جاؤ۔ کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین رات سے زیادہ چھوڑے۔

اللہ کے وہ بندے جو اللہ کو حقیقی معنوں میں اپنا معبود بنالیں، ان کا دل ہر قسم کے منفی جذبات سے خالی ہو جاتا ہے۔ جن لوگوں کا دل خدا کی بلندیوں میں اٹکا ہوا ہو، وہ دنیا کی پستیوں میں لت پت ہو کر نہیں رہ سکتے۔ ایسے لوگ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہتے لگتے ہیں جیسے ہوا لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہے مگر وہ کسی سے نہیں ٹکراتی۔ جیسے پھول کی مہک ہر ایک کو پہنچتی ہے مگر وہ ایک اور دوسرے میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔ جیسے روشنی ہر ایک کے پاس آتی ہے مگر وہ کسی سے خوش اور کسی سے خفا نہیں ہوتی۔ ایسے لوگ اسی طرح ایک دوسرے کے مکمل ساتھی ہوتے ہیں جیسے باغ کے درخت ایک دوسرے کے ساتھ بغیر کسی قسم کی باہمی رنجش کے ایک مقام پر کھڑے ہوئے ہوں۔

اسلام کے رزق سے آدمی کو حصہ ملا ہے یا نہیں، اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے بھائیوں کے درمیان اس طرح رہنے لگے کہ اس کو نہ کسی سے بغض ہو اور نہ حسد۔ کسی قابل شکایت بات پیش آنے پر وہ اپنے بھائی سے بگڑ نہ جاتا ہو۔ وہ سارے لوگوں کو اللہ کی عیال سمجھ کر اس طرح رہ رہا ہو جیسے ایک باپ کی اولاد مل جل کر رہتی ہے۔ اس قسم کا ذہن جس شخص کے اندر پیدا ہو جائے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایسا ہو جائے گا کہ کسی بھائی سے اگر اس کا بگاڑ ہو جائے اور وقتی تاثر سے مغلوب ہو کر وہ اس سے جدائی اختیار کرلے تو تین دن گزرتے گزرتے اس کا سینہ پھٹنے لگے گا۔ وقتی جذبہ نے اس کو جس بھائی سے دور کیا تھا، اس سے وہ اپنے رب کی خاطر دوبارہ اس طرح مل جائے گا جیسے کہ اس کے ساتھ کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

مسلمانوں کے ۳۴ آزاد ممالک ہیں جن کی آبادی تقریباً ۷۰ کرور ہے۔ جغرافی طور پر کل دنیا کا ۲۱ فی صد وہ حصہ ہے جہاں مسلمانوں کو اقتدار حاصل ہے۔ مسلمان دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۲۳ فی صد ہیں۔ دنیا کے قدرتی ذرائع کا تقریباً نصف حصہ ان کے قبضہ میں ہے۔ مگر تعلیم، باہمی اتحاد، صنعتی ترقی میں وہ دنیا بھر میں سب سے پیچھے ہیں۔ اتنی بڑی تعداد اگر مذکورہ حدیث کے مطابق آپس میں بھائی بھائی بن کر تو وہ ایسی طاقت ہوگی جس کو زیر کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں۔

یہ دشمن کا ہتھیار ہے

اسرائیلی لیڈر موشے دایان (پیدائش ۱۹۱۵) نے اپنی خود نوشت سوانح عمری شائع کی ہے جس کا نام ہے میری زندگی کی کہانی (The Story of my Life) اسرائیل کے سابق وزیر جنگ نے اپنے حالات کے ذیل میں عربوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔ غیر متحد عرب جو ہر چھوٹے بڑے مسئلہ پر ایک دوسرے سے لڑتے رہتے ہیں، اسرائیل کے لئے کوئی خطرہ نہیں بن سکتے :

The Arabs, Disunited and at odds with one another
over every Issue, big and small, present no threat

ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ کسی انسانی معاشرہ میں اختلاف نہ ہو۔ تاہم یہ انتہائی طور پر ضروری ہے کہ اختلاف کو ٹکراؤ اور دشمنی تک پہنچنے نہ دیا جائے۔ اختلاف جب تک فکری اختلاف کے درجہ میں ہو اس سے کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوتا۔ مگر جب اختلاف باہمی ٹکراؤ کی صورت اختیار کرے تو اس سے بڑی کمزوری کسی معاشرہ کے لئے اور کوئی نہیں۔

اسلام میں اتحاد و اتفاق کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ وہ مسلم گروہ خدا کی نصرت سے محروم ہو جاتا ہے جس کے افراد آپس میں ایک دوسرے سے جھگڑنے لگیں۔ حدیث میں ہے کہ لیلۃ القدر کے تعین کا علم صرف اس لئے اٹھالیا گیا کہ مدینہ میں دو مسلمان باہم لڑ پڑے تھے۔

عن عبادة بن الصامت قال خرج النبی صلی اللہ علیہ وسلم لیخبرنا بلیلۃ القدر فتلاحیٰ رجلان من المسلمین فقال خرجت لاخبرکم بلیلۃ القدر فتلاحی فلان وفلان فرفعت (بخاری)

عبادہ بن صامتؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز نکلے کہ ہم کو شب قدر کے بارے میں بتا دیں کہ وہ کس روز ہے۔ اس وقت دو مسلمان آپس میں (ایک قرض کے بارے میں) لڑ پڑے۔ آپ نے فرمایا، میں اس لئے نکلا تھا کہ تم کو شب قدر کی خبر دے دوں۔ مگر فلاں اور فلاں آپس میں لڑ پڑے۔ پس اس کا علم اٹھا لیا گیا۔

حافظ ابن کثیر اس روایت کو نقل کرنے کے بعد اپنی تفسیر (سورۃ القدر) میں لکھتے ہیں : ان المماراۃ تقطع الفائدۃ والعلم النافع کما جاء فی الحدیث ان العبد لیحرم الرزق بالذنب یصیبہ (آپس کا لڑائی جھگڑا لوگوں کو فائدہ سے محروم کر دیتا ہے اور نفع بخش علم ان سے اٹھا لیا جاتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ بندہ جب گناہ کرتا ہے تو وہ ملنے والے رزق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔

اتحاد کی قیمت

بیہقی اور ابن عساکر نے حضرت عروہ ابن زبیر سے روایت کیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ ذات السلاسل کے لئے ایک دستہ حضرت عمرو بن العاص کی سرداری میں بھیجا۔ یہ جگہ شام کے اطراف میں تھی حضرت عمرو بن العاص جب وہاں پہنچے اور حالات معلوم کئے تو دشمن کی کثرت سے ان کو خوف پیدا ہوا۔ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پیغام بھیج کر مزید مدد طلب کی۔ آپ نے مہاجرین کو بلایا اور دو سو آدمیوں کا ایک دستہ تیار کیا۔ اس دستہ میں حضرت ابوبکر اور حضرت عمر وغیرہ بھی شامل تھے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کو کو اس دستہ کا امیر مقرر کیا اور حکم دیا کہ فوراً روانہ ہوں اور حضرت عمرو بن العاص سے جاکر مل جائیں۔

حضرت ابو عبیدہ بن الجراح کا دستہ جب منزل پر پہنچا اور دونوں دستے ساتھ ہو گئے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ دونوں کا امیر کون ہو۔ حضرت عمرو بن العاص نے کہا: میں تم سب کا امیر ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی مدد کے لئے لکھا تھا تم لوگ اس کے مطابق میری مدد کے لئے بھیجے گئے ہو۔ حضرت ابو عبیدہ کے ساتھ جو مہاجرین آئے تھے انھوں نے اس کو نہیں مانا۔ انھوں نے حضرت عمرو بن العاص سے کہا: تم اپنے ساتھیوں کے امیر ہو اور ابو عبیدہ ہمارے امیر ہیں (بل انت امیر اصحابك وابوعبیدة امیر المهاجرین) حضرت عمرو بن العاص اس تقسیم پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ تمھاری حیثیت امدادی فوج کی ہے اور تم لوگ میرا ساتھ دینے کے لئے بھیجے گئے ہو (انما انتم امددت بكم فانا القائد) حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے جب یہ حال دیکھا تو کہا:

تعلم یا عمرو، ان آخر ما عهد الیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم ان قال: اذا قدمت علی صاحبك فتطاوعا ولا تختلفا، وانك والله ان عصیتنی لاطعتك

اے عمرو تم پر واضح ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو رخصت کرتے ہوئے جو آخری عہد لیا وہ یہ تھا کہ جب تم اپنے ساتھی کے پاس پہنچو تو دونوں اتفاق کے ساتھ مل کر کام کرنا، باہم اختلاف نہ کرنا۔ پس خدا کی قسم اگر تم میری بات نہ مانو گے تب بھی میں تمھاری اطاعت کروں گا

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد ابو عبیدہ نے امارت عمرو بن العاص کے حوالے کر دی اور ان کی ماتحتی میں کام کرنے پر راضی ہو گئے (فسلّم ابوعبیدة الامارة لعمرو بن العاص) البدایہ والنہایہ جلد ۴

اگر دونوں اپنا اپنا اصرار جاری رکھتے تو مسئلہ ختم نہ ہوتا اور جو طاقت دشمن سے مقابلہ کے لئے بھیجی گئی تھی وہ آپس میں لڑ کر فنا ہو جاتی۔ ایسے اختلافی مواقع پر ایک شخص کا جھکنا پوری جماعت کو طاقت ور بنا دیتا ہے اور ایک شخص کے نہ جھکنے سے پوری جماعت کمزور ہو جاتی ہے۔

اختلاف کی حد

حضرت معاویہ بن ابی سفیان ہجرت سے ۱۷ سال پہلے پیدا ہوئے اور ۶۰ھ میں وفات پائی۔ حضرت علی چوتھے خلیفہ مقرر ہوئے تو امیر معاویہ شام کے حاکم تھے۔ اس کے بعد دونوں میں اختلاف ہوا اور باہم زبردست لڑائیاں ہوئیں۔ امیر معاویہ تقریباً ۴۰ سال تک حکمراں رہے۔ ۲۰ سال شام کے گورنر کی حیثیت سے اور ۲۰ سال تمام اسلامی دنیا کے خلیفہ کی حیثیت سے۔

جس زمانہ میں حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان اختلافات بہت بڑھے ہوئے تھے، قسطنطنیہ کی عیسائی (رومی) حکومت نے سمجھا کہ یہ وقت مسلم سلطنت پر حملہ کرنے کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس نے ایک بڑی فوج جمع کی اور ایران کے شمالی صوبوں پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ علاقہ اس وقت حضرت علی کی حکومت میں شامل تھا۔ اس نازک موقع پر جب کہ علی و معاویہ میں جنگ چھڑی ہوئی تھی اگر یہ حملہ ہو جاتا تو حضرت علی کے لئے اس کو بچانا مشکل ہو جاتا۔ بظاہر دکھائی دیتا تھا کہ اسلامی خلافت کا ایک وسیع علاقہ کٹ کر عیسائی سلطنت میں شامل ہو جائے گا۔

عیسائی حکمراں قسطنطنیہ کے قلعہ میں بیٹھا ہوا تمام خبریں لے رہا تھا۔ وہ اسلامی خلیفہ (حضرت علی) کی مشکلات سے خوب واقف تھا۔ اس کو یقین تھا کہ علی، معاویہ کے لئے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ضرور علی کو کمزور کرنے کی عیسائی کوششوں سے خوش ہوں گے اور مزاحمت کرنے والوں میں شامل نہ ہوں گے۔ اس طرح معاویہ کی غیر جانبداری علی کو زیر کرنے میں نہایت مؤثر ثابت ہوگی اور اس کی مہم آسانی سے کامیابی کے مرحلہ تک پہنچ جائے گی۔

مگر امیر معاویہ ایک اونچے انسان تھے۔ وہ حضرت علی سے اختلاف کے باوجود ان کے معاند نہیں بن گئے تھے۔ وہ اس معاملہ کو اس حد تک لے جانے کے لئے تیار نہ تھے کہ ان دونوں کا باہمی اختلاف اسلامی دنیا میں رومیوں کے دوبارہ داخلہ کا سبب بن جائے۔ انھوں نے جب یہ خبر سنی تو قیصر (قسطنطنیہ کے عیسائی حکمراں) کو خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا:

> اے رومی کتے، اگر تو ہمارے آپس کے اختلافات سے فائدہ اٹھا کر اسلامی خلافت پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو تجھ کو معلوم ہونا چاہئے کہ علی کی قیادت میں جو لشکر تیرے مقابلہ کے لئے نکلے گا، معاویہ اس لشکر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوگا۔

یہ خط قسطنطنیہ کے عیسائی حکمراں کی امیدوں کے عین خلاف تھا۔ اس کو پڑھ کر وہ اتنا گھبرا اٹھا کہ اس نے اسلامی علاقہ پر حملہ کا ارادہ ترک کر دیا۔

مشورہ پر اصرار نہیں

بدر کی لڑائی (۲ ھ) سے کچھ پہلے قریش کا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ ساٹھ آدمیوں کی سرکردگی میں شام بھیجا گیا تھا۔ اس تجارتی قافلہ میں مکہ کے مردوں اور عورتوں نے اپنا تمام سرمایہ لگا دیا تھا۔ بدر کی لڑائی میں قریش کو مکمل شکست ہوئی۔ تاہم ابوسفیان کو اس میں کامیابی ہوئی کہ وہ تجارتی قافلہ کو ساحلی راستہ سے چلا کر مکہ پہنچ جائیں۔ جنگ کے بعد سارا مکہ جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ قریش کے ذمہ دار افراد کا ایک اجتماع دار الندوہ میں ہوا۔ اس اجتماع میں متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ تجارتی قافلہ کے شرکا صرف اپنا اصل سرمایہ لے لیں اور منافع کی رقم پوری کی پوری محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف جنگ کی تیاری میں لگا دی جائے۔ منافع کی یہ رقم پچاس ہزار دینار تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ اب قریش نے زبردست تیاری کی اور شوال ۳ھ میں مکہ سے نکل کر مدینہ پر حملہ کے لئے روانہ ہوئے۔

اسی جنگ کا نام جنگ احد ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر ملی تو آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ بڑے صحابہ میں سے اکثر کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے۔ مگر نوجوان طبقہ اس کا پرجوش مخالف تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہم یہاں ٹھہریں گے تو دشمن اس کو ہماری بزدلی اور کمزوری پر محمول کرے گا۔ اس لئے ہمیں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے۔ عبد اللہ بن ابی کی رائے بھی وہی تھی جو اکابر صحابہ کی تھی۔ (سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۷)

جن لوگوں کی رائے یہ تھی کہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کیا جائے، اس کی بڑی وجہ مدینہ کا جغرافیہ تھا جو ایک قدرتی حصار کا کام کرتا تھا۔ مدینہ کا جائے وقوع ایسا تھا کہ اس کے جنوب میں کھجوروں کے گھنے باغات اس کثرت سے تھے کہ ادھر سے کوئی فوج بستی کے اوپر حملہ نہیں کر سکتی تھی۔ اسی طرح مشرق اور مغرب کے بڑے حصہ میں پہاڑیاں تھیں جو کسی فوجی پیش قدمی کے لئے قدرتی روک کا کام کر رہی تھیں۔ اس لئے کوئی دشمن صرف ایک ہی سمت سے مدینہ پر حملہ کر سکتا تھا۔ اس جغرافی پوزیشن نے مدینہ کو جنگی اعتبار سے کافی محفوظ شہر بنا دیا تھا۔ گویا مدینہ ایک قسم کا قلعہ تھا۔ شہر سے باہر نکل کر وہ چاروں طرف سے دشمن کی زد میں ہو جاتے تھے جب کہ مدینہ کے اندر صرف ایک طرف سے مقابلہ کا انتظام کرنا تھا۔ غزوۂ احزاب میں مدینہ کے اسی جائے وقوع سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس کی کھلی سمت میں (شمال مغربی رخ پر) خندق کھود کر پورے شہر کو محفوظ کر لیا گیا تھا۔

بڑے صحابہ کی اکثریت اور عبد اللہ بن ابی کی رائے اگرچہ مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ مگر

آپ نے نوجوان طبقہ کی رائے کا لحاظ کیا اور ایک ہزار آدمیوں کے ساتھ مدینہ سے نکل کر احد کی طرف روانہ ہوئے۔ عبد اللہ بن ابی نے جب دیکھا کہ اس کی رائے نہیں مانی گئی جو بظاہر حالات معقول بھی تھی تو اس کو بہت دکھ ہوا۔ وہ مدینہ سے ساتھ نکل پڑا تھا مگر دل کے اندر غصہ باقی تھا۔ چنانچہ اسلامی لشکر ابھی مدینہ اور احد کے درمیان تھا کہ عبد اللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر مدینہ کی طرف واپس ہوگیا۔ عبد اللہ بن ابی نے کہا:

اطاعهم وعصاني، ما ندري علام نقتل انفسنا ههنا ايها الناس

رسول اللہ نے ان کی بات مان لی اور میری بات نہیں مانی۔ اے لوگو! ہم کو نہیں معلوم کہ ہم اپنی جانوں کو یہاں کیوں ہلاک کریں۔

(سیرۃ ابن ہشام جلد ۳ صفحہ ۸)

احد کی جنگ میں شکست نے یہ ثابت کیا کہ انھیں لوگوں کی رائے درست تھی جو مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کے لئے کہتے تھے اور باہر نکلنے سے روکتے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد غزوۂ خندق (۵ھ) میں اسی رائے کو اختیار کیا گیا اور مدینہ میں رہ کر مقابلہ کی تدبیر کی گئی۔ تاہم تمام بڑے صحابہ اپنے اختلاف رائے کو بھول کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور جنگ میں شدید نقصان اور تکلیف کے باوجود پوری بے جگری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ صرف عبد اللہ بن ابی الگ ہوا اور اس کی بنا پر رئیس المنافقین کہلایا۔ عبد اللہ بن ابی کی رائے اصولاً درست تھی۔ تجربہ نے بھی اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کی۔ مگر صحت رائے کے باوجود اطاعت سے نکلنا اس کے لئے گمراہی اور خدا کی ناراضی کا سبب بن گیا۔

اسلام میں مشورہ کی بے حد اہمیت ہے۔ ہر آدمی کو حق ہے کہ وہ اپنا مشورہ پیش کرے۔ لیکن ہر مشورہ دینے والا اگر یہ بھی چاہے کہ اس کے مشورہ پر ضرور عمل کیا جائے تو کبھی کوئی کام نہیں ہو سکتا کیونکہ مختلف رایوں میں سے کسی ایک ہی رائے کو عملاً اختیار کیا جا سکتا ہے نہ کہ ہر رائے کو۔ سچے مسلمان وہ ہیں جو مشورہ پیش کرنے کے بعد اپنا مشورہ بھول جائیں اور ذمہ داروں کی طرف سے جو فیصلہ ہو اس کو اس طرح مان لیں جیسے وہی ان کی اپنی رائے تھی۔

"سب سے بڑی قربانی رائے کی قربانی ہے"، کسی شخص کا یہ قول بہت با معنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رائے کی قربانی واحد چیز ہے جس کے اوپر کوئی مضبوط اجتماعیت کھڑی ہوتی ہے۔ کوئی عمارت صرف اس وقت بنتی ہے جب کہ کچھ اینٹیں اپنے آپ کو زمین میں دبانے کے لئے تیار ہوں۔ اسی طرح کوئی حقیقی اجتماعیت صرف اس وقت قائم ہوتی ہے جب کہ کچھ لوگ اس کے لئے تیار ہوں کہ وہ اپنی رایوں کو اپنے سینہ میں چھپا لیں گے اور اختلاف رائے کے باوجود اتحاد عمل کا ثبوت دیں گے۔ اس قربانی کے بغیر کسی انسانی اجتماعیت کا وجود میں آنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا اینٹوں کے بنیاد میں دفن ہوئے بغیر عمارت کا وجود میں آنا۔

اتحاد کی طاقت

کسی شخص نے کبھی یہ نہیں سنا ہوگا کہ سورج کی گرمی سے کاغذ جل گیا۔ حالاں کہ سورج کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ کاغذ تو کیا پورا کا پورا پہاڑ بلکہ سارا کرۂ ارض اس طرح جل سکتا ہے جیسے کسی بھڑکتے ہوئے تنور میں ایک تنکا۔ مگر یہی سورج جس کی گرمی اتنی زیادہ ہے کہ بڑے بڑے جنگلوں اور پہاڑوں کو بھک سے اڑا دے وہ موجودہ حالت میں ایک تنکے کو بھی جلانے پر قادر نہیں ہے، ایسا کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی شعاعیں لاکھوں کروروں میل کے دائرے میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس انتشار کی وجہ سے کسی ایک چیز پر بیک وقت اس کی شعاعیں اتنی مقدار میں نہیں پڑتیں کہ وہاں وہ اتنی گرمی پیدا کر سکیں جو کسی چیز کو جلانے کے لئے ضروری ہے۔ حالاں کہ یہی بکھری ہوئی شعاعیں اگر سمیٹ دی جائیں تو وہ خوفناک الاؤ کی شکل میں بھڑک سکتی ہیں۔

آفتابی چولھا سورج کی شعاعوں کے اسی قسم کے ارتکاز کا نام ہے۔ بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک خاص دائرے میں سمیٹ دینے کی وجہ سے اس جگہ اتنی گرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ کھانا پکنے لگتا ہے۔ آفتابی چولھا تو ابھی بہت کم رائج ہو سکا ہے مگر آتشیں شیشہ (Burning Glass) ایک ایسی چیز ہے جو اکثر اشخاص نے کبھی نہ کبھی دیکھا ہوگا۔ آتشیں شیشہ کیا ہے۔ یہ ایک محدب یا کروی عدسہ (Convex Lens) ہے جس سے کاغذ یا دوسری آتش پذیر چیزوں میں آگ لگائی جا سکتی ہے۔ عام حالات میں کاغذ پر سورج کی جو شعاعیں پڑتی ہیں، وہ اتنی زیادہ گرمی نہیں پیدا کر سکتیں کہ اس میں آگ لگ جائے۔ مگر انھیں شعاعوں کو جب مجتمع کر دیا جاتا ہے تو وہ شعلہ کی مانند بھڑک اٹھتی ہیں۔ کوئی بھی شخص تجربہ کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ لنس ان شعاعوں کو طاقت ور بنانے کے لئے کیا کرتا ہے، ذیل کے نقشہ میں شعاعیں آتشیں شیشہ سے گزر کر مڑ رہی ہیں۔

بکھری ہوئی شعاعیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر طاقت ور ہو جاتی ہیں

اس نقشہ کے مطابق آتشیں شیشہ کا تمام تر عمل صرف یہ ہے کہ وہ ان شعاعوں کو جمع کرے جو لنس کے پورے دائرے میں پڑ رہی ہیں اور ان کو اس طرح موڑے یا منعطف کر دے کہ وہ سب اکٹھا ہو کر ایک محدود رقبہ پر پڑنے لگیں۔ سورج کی شعاعوں کا یہ اجتماع اس محدود رقبہ میں اتنی حرارت پیدا کر دیتا ہے کہ کاغذ جلنے لگتا ہے۔

یہ مثال میں نے یہ واضح کرنے کے لئے دی ہے کہ انتشار اور اجتماع میں کیا فرق ہے۔ ایک ہی چیز اگر منتشر حالت میں ہو تو وہ بے وزن ہے۔ لیکن اگر اسے اکٹھا کر دیا جائے تو اتنی زبردست طاقت بن سکتی ہے جس کا پہلے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ہندستان کے مسلمان اس وقت جس کمزوری کی حالت میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں وہ حقیقۃً اتنے کمزور نہیں ہیں، یہ کمزوری ان کے انتشار کی پیدا کردہ ہے۔ اگر وہ اپنے درمیان اجتماعیت کا آتشیں شیشہ فراہم کر لیں اور انفرادی طور پر بکھری ہوئی شعاعوں کو ایک مقام پر مجتمع کر دیں تو یکایک وہ دیکھیں گے کہ جو شعاعیں الگ الگ ہونے کی صورت میں تنکا جلانے کے لئے بھی ناکافی نظر آتی تھیں، انھیں کی گرمی سے شہتیر بھڑک اٹھا ہے۔ ہماری موجودہ تعداد اور موجودہ ذرائع و وسائل جو منفرد طور پر بالکل بے قیمت نظر آتے ہیں، یہی تعداد اور یہی ذرائع کروروں گنا زیادہ اہمیت اختیار کر لیں گے۔ آج ہر مسلمان اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کو ایک پوری قوم کی مانند سمجھنے لگے گا۔ اور جب ایسا ہو گا تو دوسرے بھی ہم کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسا کہ فی الواقع ہم اپنے آپ کو سمجھتے ہیں۔ ہندستان میں مسلمانوں کی تعداد دس کروڑ بتائی جاتی ہے۔ یہ دس کروڑ افراد گویا دس کرور دھاگے ہیں، اگر وہ الگ الگ ہوں تو کوئی شخص بھی انھیں باری باری توڑ سکتا ہے۔ لیکن یہی دس کروڑ دھاگے اگر مل جائیں تو وہ اتنا مضبوط رسا بن جائیں گے جنھیں ایک ہاتھ تو کیا سیکڑوں ہاتھ بھی توڑنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔ جو چیز الگ سے دیکھنے میں محض ایک دھاگا ہے وہ اتحاد کی برکت سے موٹے رسے کا مقام حاصل کرے گی۔ قطرہ سمندر میں ہو تو وہ سمندر ہے اور باہر ہو تو وہ قطرہ کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہ اتحاد اور اجتماعیت موجودہ حالات میں مسلمانوں کی شدید ترین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر حالات کے سدھار کے لئے کوئی مؤثر کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اصلاح حال کی ہر تجویز اپنی کامیابی کے لئے یہ چاہتی ہے کہ مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہوں تاکہ زیادہ سے زیادہ ذرائع و وسائل اس کے لئے مہیا ہو سکیں، زیادہ سے زیادہ حمایت کے ساتھ اس کو مؤثر بنایا جا سکے، جب وہ دنیا کے سامنے آئے تو لوگوں کو وہ زیادہ سے زیادہ وقیع اور باوزن معلوم ہو۔

کوئی بھی اجتماعیت، خواہ وہ کتنے ہی ہلکے درجہ کی ہو، بہرحال قربانی چاہتی ہے ——— وقت کی قربانی، رائے کی قربانی، حیثیت کی قربانی، ذاتی مفادات کی قربانی۔ کبھی ایسا ہو گا کہ ذاتی دائرہ میں آپ کو محسوس ہو گا کہ آپ کا وقت ضائع ہو رہا ہے، مگر قوم کو اس کی ضرورت ہو گی، کبھی اپنی رائے کو محض اس لئے

چھوڑنا ہوگا کہ دوسروں کو آپ اس کا قائل نہیں کر سکے اور اشتراک کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ آپ اپنی رائے سے عملی طور پر دست بردار ہو جائیں۔ کبھی آپ دیکھیں گے کہ اجتماعی ڈھانچہ میں آپ کی حیثیت گھٹ رہی ہے مگر اس کے باوجود ڈھانچہ کو برقرار رکھنے کے لئے آپ اپنی حیثیت کو نظر انداز کر دیں گے ۔ کبھی اجتماعی تقاضے آپ کے ذاتی مفادات کو متاثر کرنے لگیں گے۔ ضرورت پکارے گی کہ اس وقت اپنا سرمایہ ذاتی خواہش میں نہیں بلکہ قوم کے کام میں لگاؤ اور آپ اس پکار کو لبیک کہیں گے، کبھی ذاتی اور خاندانی مصالح پر قوم کی مصالح کو ترجیح دینا ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک ایسے معاشرہ میں یہ اجتماعیت قائم نہیں ہو سکتی جہاں صدارت اور نظامت حاصل کرنے کے لئے رسہ کشی ہوتی ہو۔ جہاں قوم کے پڑھے لکھے لوگ محض بیرونی ملکوں کی سیاحت کی قیمت پر اس کے لئے راضی ہو جائیں کہ وہ باہر جاکر قوم کی غلط نمائندگی کریں۔ جس کے افراد کو محض ایک اچھا عہدہ دے کر خریدا جاسکتا ہو، جہاں ایک مسلم گروہ دوسرے مسلم گروہ کو شکست دینے کے لئے قوم کے دشمنوں سے مل جاتا ہو، جہاں یہ حال ہو کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے خفا ہو تو پولیس کے دفتر میں اس کے خلاف مخبری کرنے پہنچ جائے۔ جہاں نظر آئے کہ کچھ لوگ ایک ملی کام کے لئے اٹھیں تو بقیہ لوگ اس کا تعاون کرنے کے بجائے یہ سوچنے لگیں کہ کہیں یہ میدان پر قابض نہ ہو جائیں اور فوراً اسی کام کے لئے ایک اور علیحدہ تنظیم قائم کر کے لوگوں کو اپنی طرف بلانا شروع کر دیں۔ جہاں ملت کی ضروریات، خدمت کرنے کا میدان نہ ہوں بلکہ لیڈری حاصل کرنے کا سستا ذریعہ بن جائیں۔ جہاں لوگ اجتماعی احساس سے اس قدر ناآشنا ہوں کہ اختلافات پر گالی گلوج ہونے لگے اور ترک کلام کی نوبت آجائے۔ جہاں لوگوں کی سطحیت کا عالم یہ ہو کہ اتحاد کے بجائے اختلاف کے اجزاء ڈھونڈتے ہوں، جہاں گروہ بندی اس شدت کو پہنچی ہوئی ہو کہ اپنے دائرہ سے باہر نہ کسی حق کو تسلیم کریں اور نہ اپنے سوا کسی کو کام کرنے کا اہل سمجھتے ہوں۔ جہاں پستی کا یہ عالم ہو اور جہاں اجتماعی اوصاف کی اس درجہ کمی ہو وہاں تمام لوگ آخر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع کس طرح ہوں گے ——— حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے ضروری کام یہ ہے کہ قوم کو اخلاقی پستی سے نکالا جائے اور اس کے اندر اجتماعی احساس پیدا کیا جائے۔ اس کے بعد ہی یہ ممکن ہے کہ ہمارے اندر کوئی اجتماعیت برپا ہو سکے۔

اتحاد اور اجتماعیت کے بغیر ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اور اتحاد اور اجتماعیت ایسی چیز ہے جو پوری طرح ہمارے بس میں ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے لئے ناممکن نہیں۔ بقیہ تمام چیزوں کے لئے دوسروں کو بدلنا پڑتا ہے۔ جب کہ اتحاد قائم کرنے کے لئے ہمیں صرف اپنے آپ کو بدلنا ہے۔ اب اگر ایک ایسے امکان کو بھی ہم حاصل نہیں کرتے جو خود ہمارے اپنے بس میں ہو تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ مستقبل کا مورخ یقیناً ہم کو مجرم ٹھہرائے گا، خواہ اپنے طور پر ہم دوسروں کو اپنی مصیبت کا ذمہ دار سمجھتے ہوں۔

(ماہنامہ الفرقان جمادی الثانی ۱۳۸۴ھ)

مسجد کا سبق

مسجد کے صحن اور برآمدے میں نمازی بکھرے ہوئے تھے۔ کوئی وضو کر رہا تھا، کوئی سنتوں میں مشغول تھا، کوئی فارغ ہوکر بیٹھا ہوا تھا۔ غرض برآمدے سے لے کر صحن تک مختلف لوگ مختلف حالتوں میں مشغول تھے۔ سب ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے تھے۔ ہر ایک اپنے انفرادی عمل میں مصروف نظر آتا تھا۔

اتنے میں گھڑی نے ٹن ٹن پانچ بجائے اور امام صاحب اپنے حجرہ سے نکل کر مصلّے پر کھڑے ہوگئے۔ "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی بلند آواز نے لوگوں کو بتایا کہ جماعت کھڑی ہوگئی ہے۔

امام کے پیچھے ایک کے بعد ایک صفیں بننے لگیں۔ جو لوگ مسجد کے مختلف حصوں میں بکھرے ہوئے تھے، آآ کر صف میں ملنے لگے۔ کچھ لوگ پہلے پہنچے۔ کچھ لوگ دیر میں آکر صف میں شامل ہوئے۔ چند منٹ کے اندر سارا پھیلا ہوا مجمع امام کے پیچھے قطار در قطار ایک منظم فوج کی طرح کھڑا ہوگیا۔ سب صف کے اندر شامل تھے۔ ہر شخص کا رخ ایک تھا۔ ہر شخص ایک آواز پر حرکت کر رہا تھا۔ سب ایک ساتھ اٹھتے، ایک ساتھ بیٹھتے اور ایک ساتھ اپنے رب کے آگے جھک جاتے۔

یہ منظر دیکھ کر دل نے کہا "جو منظر مسجد کے اندر دکھائی دے رہا ہے، کیا وہی مسجد کے باہر بھی واقعہ بنے گا۔ کیا مسلمانوں کا بکھرا ہوا قافلہ سب ایک مرکز پر جمع ہو جائے گا۔ کیا یہ نماز پڑھنے والے مسجد کے باہر بھی مسجد کا سبق دہرائیں گے۔

یہ واقعہ بے شمار مسجدوں میں ہر روز ہوتا ہے۔ ہر روز نماز کے ذریعہ مظاہرہ کرکے مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کیسی ہونی چاہئے۔ مگر کوئی اس سے سبق نہیں لیتا، مسجد کا عمل مسجد سے باہر لوگوں کی زندگیوں میں واقعہ نہیں بنتا۔

مسجد کی نماز بیک وقت دو چیزوں کا سبق ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کو چاہئے کہ وہ خدا کے آگے جھک جائیں، وہ خدا کے سامنے عاجز بن کر رہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ایک آواز پر حرکت کریں، وہ دنیا میں نظم اور اجتماعیت کے ساتھ زندگی گزاریں۔ لوگ روزانہ پانچ بار مسجد میں یہ سبق لیتے ہیں۔ مگر مسجد کے باہر آتے ہی اسے بھول جاتے ہیں۔ ان کی مسجد سے باہر کی زندگی میں نہ عجز اور تواضع کا رنگ نظر آتا اور نہ اتحاد اور اجتماعیت کا۔ حالاں کہ یہ دونوں چیزیں اتنی اہم ہیں کہ اگر وہ مسلمانوں کی زندگی میں پوری طرح آجائیں تو ان کا وجود دنیا میں ایک عظیم انقلاب کا سبب بن جائے۔

انتشار سے اتحاد تک

میرے سامنے دور تک پھیلا ہوا میدان تھا۔ اونچا نیچا میدان۔ اس میدان میں گڈریہ کی بھیڑ بکریاں بہت بڑی تعداد میں بکھری ہوئی تھیں۔ کوئی کھلی جگہ پر تھی، کوئی جھاڑی میں گھسی ہوئی تھی کوئی گہرائی میں اتر گئی تھی، کوئی درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ غرض بھیڑ بکریوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مگر سب منتشر۔ ہر ایک کا رخ الگ تھا۔ ہر ایک کی سرگرمیاں جدا تھیں۔

یہ منظر دیکھ کر میں کھڑا ہو گیا "جو حالت ان بھیڑوں کی ہے وہی حالت اس وقت ہماری ملت کی ہے،" میں نے سوچا "کروروں کی تعداد رکھنے والی ایک قوم بالکل انتشار کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ ہر ایک اپنی پسند کے رخ پر بھاگا جا رہا ہے۔ لوگوں کی سمت سفر یکساں نہیں۔ ان کے درمیان ایسی منصوبہ بندی نہیں کہ ہر ایک کی جد و جہد بالآخر پوری ملت کے لئے مفید بن سکے۔ ان کے درمیان مقصد کا وہ اشتراک نہیں جو مختلف افراد کو ایک رشتہ میں پرو دیتا ہے۔ ان کے افراد بکھرے ہوئے ہیں۔ ان کی قوت ضائع ہو رہی ہے۔ ان کو اپنا شعور نہیں ۔ ۔ ۔

میں بھیڑ بکریوں کا منظر دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہونے لگی۔ اب گڈریہ کی واپسی کا وقت ہو گیا۔ اس نے آواز لگائی اور اس کی آواز سن کر تمام بھیڑیں اپنے اپنے مقامات سے نکل کر اس کی سمت میں چل پڑیں۔ گڈریہ نے اپنے دو لڑکوں کی مدد سے گلہ کو سمیٹا اور ان کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اب میرے سامنے دوسرا منظر تھا۔ منتشر بھیڑیں ایک ریوڑ کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ اب وہ سب کی سب ایک گڈریہ کے ساتھ جمع تھیں۔ سب ایک سمت میں چل رہی تھیں۔ سب اکٹھا تھیں مگر ان میں کوئی ٹکراؤ نہیں تھا۔ سب شانہ سے شانہ ملا کر چلی جا رہی تھیں۔ ان کا مقصد متعین تھا۔ ان کی منزل معلوم تھی۔ ان کو جانا تھا اور چلے جانا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے معلوم مقام پر پہنچ جائیں۔

اب میرے دل میں خیالات کا نیا طوفان امڈنے لگا۔ بھیڑ بکریوں کے "انتشار" کو "اجتماع" بنتے دیکھ کر میں نے سوچا: "کیا ہماری ملت کا منتشر انبوہ بھی کسی دن ریوڑ بنے گا۔ کیا ہم بھی ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوں گے۔ کیا ہم بھی شانہ بشانہ مل کر چلیں گے۔ کیا ہمیں بھی اپنے مشترک مقصد کا شعور حاصل ہو گا۔ کیا ہمارا بھی رخ متعین ہو گا۔ کیا ہمارا قافلہ بھی منزل کی طرف چل پڑے گا۔ بھیڑ بکریوں کے لئے تو یہ لمحہ چند گھنٹوں کے بعد آ گیا۔ ہمارے لئے یہ لمحہ کب آئے گا ۔ ۔ ۔

یہ بات ہم میں کیوں نہیں

بڑھئی پورے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس کے سامنے مختلف قسم کی لکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو کاٹتا، کسی کو چھیلتا، کسی میں سوراخ کرتا اور کسی پر رندہ چلاتا۔ بظاہر ان مختلف چیزوں میں کوئی باہمی ربط نہیں تھا۔ ایک انجان آدمی دیکھے تو یہی رائے قائم کرے گا کہ بڑھئی قسم قسم کی لکڑیوں کو بے مقصد طور پر ٹھونکنے پیٹنے میں مشغول ہے۔

چند روز بعد نقشہ دوسرا تھا۔ اب لوگوں نے دیکھا کہ جہاں متفرق لکڑیاں بکھری ہوئی تھیں وہاں خوبصورت کرسی اور میز رکھے ہوئے ہیں۔ اب ان کو معلوم ہوا کہ بڑھئی اگرچہ بظاہر بے ترتیب عمل کر رہا تھا مگر حقیقۃً وہ نہایت مربوط کام میں مشغول تھا۔ اس کا کئی کام دراصل ایک کام تھا۔ اس کے ذہن میں ایک مکمل نقشہ تھا اور متفرق لکڑیاں اس کے اسی مکمل نقشہ کے اجزاء تھے۔ وہ ان پر اس لئے عمل کر رہا تھا کہ ان کو اپنے کلی نقشہ سے ہم آہنگ کرے اور پھر ان سب کو اپنے نقشہ کے مطابق جوڑ کر اپنے ذہنی منصوبہ کو عملی شکل دے سکے۔

یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا ——— کاش ملت کے درمیان مختلف سرگرمیوں کی بھی یہی نوعیت ہوتی۔ ہمارے اشخاص اور ہمارے ادارے طرح طرح کی سرگرمیوں میں مشغول ہیں۔ کوئی علمی کام کر رہا ہے اور کوئی تبلیغی کام۔ کوئی تعلیمی خدمت انجام دے رہا ہے اور کوئی سماجی خدمت۔ کوئی سیاسی میدان میں سرگرم ہے اور کوئی اقتصادی میدان میں۔ اگر ہمارا ذہن ایک ہو اور ہمارے درمیان ملی شعور زندہ ہو تو یہ بظاہر الگ الگ ہونے والی سرگرمیاں ایک منظم منصوبہ کی شکل اختیار کر لیں گی۔ وہ مختلف کام جو آج ایک دوسرے سے الگ الگ نظر آتے ہیں، وہ مستقبل کی اس ملت اسلامی کے اجزاء بن جائیں گے جو ہر لحاظ سے مکمل ہوگی۔ جس میں وہ سب کچھ اپنی اپنی جگہ موجود ہوگا جو ایک زندہ اور مستحکم گروہ کے لئے اس دنیا میں ضروری ہے۔

جو واقعہ کرسی اور میز کی دنیا میں روزانہ پیش آتا ہے وہی ہمارے درمیان کیوں واقعہ نہیں بنتا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ کرسی اور میز کی لکڑیاں اپنے آپ کو ایک بڑھئی کے حوالے کر دیتی ہیں اسی وقت یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ میز اور کرسی کی صورت میں ڈھل سکیں۔ اس کے برعکس ہم کسی کو اپنا "بڑھئی" ماننے کے لئے تیار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری زندگی میں وہ واقعہ ظاہر نہیں ہوتا جو لکڑی کی دنیا میں ہر آن ظہور میں آ رہا ہے۔

ٹیم کی طرح

کھیل کے میدان میں جب کسی ٹیم کے ایک فرد کو گیند ملتا ہے تو وہ گویا پوری ٹیم کو مل جاتا ہے۔ ہر ایک اپنے کو اس میں شریک سمجھنے لگتا ہے۔ سب مل کر اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سب کے دل کی دھڑکنیں بس ایک گیند پر آکر ٹھہر جاتی ہیں۔ اس وقت ہر شخص وہی چاہنے لگتا ہے جو اس کا دوسرا ساتھی چاہ رہا ہے۔

مگر ملت کی دنیا میں معاملہ بالکل مختلف ہے۔ یہاں جب اتفاقاً کسی شخص کو "گیند" ہاتھ آجائے تو وہ اس کے اپنے لئے ذاتی نمائش کا سامان ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے حسد اور رقابت کا۔ یہاں نہ گیند والا صحیح حالت پر قائم رہتا ہے اور نہ بے گیند والا۔

ملت کے جس ادارہ میں دیکھئے، ہر جگہ عہدوں اور مناصب کی جنگ نظر آئے گی۔ کہیں ایک صورت میں اور کہیں دوسری صورت میں۔ جس کو عہدہ مل گیا ہے وہ اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہے اور جس کو نہیں ملا ہے وہ نہ ملنے پر صبر کرنے کے لئے راضی نہیں ہے۔ ہر آدمی سارا کریڈٹ خود لینا چاہتا ہے، کوئی اپنے سوا دوسرے کو کریڈٹ دینا نہیں چاہتا۔

ملت کی ٹیم میں کھیل کی ٹیم والی روح نہ ہونا ہماری اکثر مصیبتوں کی جڑ ہے۔ کیونکہ گیند تو ہمیشہ ایک ہوتی ہے اور ٹیم کے افراد زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر ہر شخص یہ چاہے کہ اسی کو گیند آگے بڑھانے کا سہرا ملے تو گیند تو اپنی جگہ پڑی رہ جائے گی۔ البتہ ٹیم کے افراد آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے۔ کسی ٹیم کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس کے افراد یہ جانیں کہ کب مجھ کو گیند لے کر آگے بڑھنا ہے اور کب اس کو دوسرے کے حوالے کر دینا ہے۔ ان میں یہ حوصلہ ہو کہ وہ اصل کھیل کو دیکھیں نہ یہ کہ کریڈٹ کس کو ملتا ہے اور کس کو نہیں ملتا۔

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ دنیا کی زندگی سراسر امتحان ہے۔ بالفاظ دیگر، وہ کھیل دکھانے کی جگہ ہے نہ کہ کھیل کا انعام پانے کی جگہ۔ یہ ذہن اگر صحیح طور پر لوگوں میں پیدا ہو جائے تو ہر قسم کا ٹکراؤ اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ کیونکہ اب آدمی کی نظر اپنے فرائض پر ہوگی نہ کہ عہدوں اور مرتبوں پر۔ اس کے برعکس اگر زندگی کو امتحان نہ سمجھا جائے تو زندگی ایک دوسرے پر سبقت کا اکھاڑا بن جاتی ہے۔ باہمی ٹکراؤ کا ایسا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو کسی حد پر نہیں رکتا۔ اس کے بعد وہ فضا ہی ختم ہو جاتی ہے جس میں لوگ مل کر کام کریں اور دوسرے کی کامیابی پر اپنے دل میں خوشی کی ٹھنڈک محسوس کریں۔

انتشار اور اجتماع کا فرق

ریت خواہ کتنی ہی زیادہ مقدار میں ہو، اس کے لئے کوئی جماؤ نہیں۔ ہوائیں اس کو ہر طرف اڑاتی پھرتی ہیں۔ ہر طوفان اس کو بہالے جانے کے لئے کافی ثابت ہوتا ہے۔ مگر چٹان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے۔ چٹان کے لئے ہواؤں اور طوفانوں سے کوئی خطرہ نہیں۔ ہوا کا طوفان اگر ریت کو بے قیمت ثابت کرتا ہے تو چٹان کے لئے اس کا آنا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ اس کی مضبوطی اور استحکام کو لوگوں کی نظروں میں ثابت شدہ بنا دے۔

دونوں کے درمیان یہ فرق کیوں ہے جب کہ دونوں حقیقت کے اعتبار سے ایک ہیں۔ ریت بکھری ہوئی چٹان ہے اور چٹان جمی ہوئی ریت۔ جب دونوں اصلاً ایک ہیں تو کیوں ایسا ہوتا ہے کہ ایک پر ہوائیں قابو پا لیتی ہیں۔ مگر دوسرے پر ان کا کوئی قابو نہیں چلتا۔ اس کی وجہ انتشار اور اجتماع کا فرق ہے۔ ریت نے "منتشر" ہو کر اپنے کو ہوا کے مقابلہ میں بے زور کر لیا ہے۔ اور چٹان "مجتمع" ہونے کی وجہ سے طاقتور اور مستحکم ہے۔

یہی معاملہ انسانی زندگی کا بھی ہے۔ کوئی گروہ اگر انتشار کی حالت میں ہو، اس کے افراد ایک دوسرے سے الگ ہو کر بکھرے ہوئے ہوں تو کثرت تعداد کے باوجود ان کی کوئی اجتماعی طاقت نہ ہوگی۔ دوسروں کے مقابلہ میں ہر جگہ وہ کمزور ثابت ہوں گے، خارجی حوادث کا طوفان ان کو ریت کی مانند اڑا لے جائے گا۔ اس کے برعکس اگر اس گروہ کا حال یہ ہو کہ اس کے افراد آپس میں جڑے ہوئے ہوں، انھوں نے اپنی انفرادیت کو اجتماعیت کی صورت میں باندھ رکھا ہو تو ہر ٹکراؤ کے موقع پر وہ ناقابل تسخیر ثابت ہوں گے، باہر کے حملوں کے مقابلہ میں وہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمے رہیں گے، کوئی بھی ان کو ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں ہر وقت آدمی کا امتحان لیا جا رہا ہے۔ اس دنیا میں زندگی کا حق صرف اس کے لئے ہے جو امتحان کی جانچ میں پورا اترے۔ جو لوگ امتحان میں ناکام ثابت ہوں ان کو خدا کی اس دنیا میں جینے کا کوئی حق نہیں۔ حقائق کی یہ دنیا ایسے لوگوں کو بے قیمت قرار دے کر کوڑے خانہ میں پھینک دیتی ہے۔

اس دنیا میں آدمی کا سب سے بڑا امتحان یہ ہے کہ وہ حقیقت کی سطح پر جینے کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ جو لوگ حقیقت کی سطح پر جینے لگیں ان کے یہاں خود بخود ان چیزوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو باہمی انتشار کا سبب بنتی ہیں اور آپس کا بگاڑ اور اختلاف پیدا کر کے اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ حقیقت کی سطح پر جینے والے افراد کے باہمی تعلق ہی کا نام اتحاد ہے اور حقیقت کی سطح سے دور ہو جانے والوں کے باہمی تعلق کا نام انتشار۔

مال گاڑی کو دیکھ کر

میں ریلوے لائن کے کنارے کھڑا تھا کہ ایک مال گاڑی کی گڑگڑاہٹ نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ یہ کئی درجن ویگنوں کی ایک لمبی باہم جڑی ہوئی قطار تھی جو دیر تک میرے سامنے سے گزرتی رہی۔ ایک کے بعد ایک اس کے ڈبے انجن سے بندھے ہوئے اس طرح چلے جا رہے تھے جیسے انجن کے پیچھے چلنے کے سوا انھیں کچھ اور معلوم ہی نہ ہو۔ ویگنوں کی اس مجموعی حرکت نے ان کے اندر ایک عجیب سماں پیدا کر دیا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ حسن اور معنویت کا ایک دوڑتا ہوا نشان بن گئے ہوں۔

"یہ خوش قسمتی کیا صرف مال گاڑی کے ویگنوں کے لئے مقدر ہے" میں نے سوچا "مال کے ڈبوں کو ان کے مقرر راستہ پر لے جانے کے لئے ایک انجن ہے۔ کیا ہمارے انسانی قافلہ کے لئے کوئی انجن نہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ ملت کے کروروں افراد کا بھی ایک انجن ہو اور اس کے تمام افراد اس سے جڑ کر خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر رواں دواں ہوں۔ کیا ہمارا قافلہ حسن اور معنویت کے اس مجموعہ کی صورت میں نہیں ڈھل سکتا جس کا ثبوت یہ دھات کے ڈبے دے رہے ہیں۔ مال کے ڈبے جو ہماری نظر میں اتنے حقیر ہیں کہ ہم کو سفر کے لئے دئے جائیں تو ہم اس میں بیٹھ کر سفر کے لئے تیار نہ ہوں۔ وہ ایک انجن سے جڑ کر اپنا مشترک قافلہ بنا لیتے ہیں اور سب مل کر اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ کیا یہی عمل ہم اپنی زندگی میں نہیں دہرا سکتے۔

آہ وہ بھیڑ جو ایک قافلہ نہیں بن سکتی۔ اور آہ وہ قافلہ جو اپنے آپ کو ایک انجن کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہیں۔

دھات کے مجموعوں کا اتنا کامل طور پر بامعنی کردار ادا کرنا بے سبب نہیں ہے۔ یہ انسان کے لئے خدا کے قائم کئے ہوئے نمونے ہیں۔ یہ بے خطا کارکردگی کے نمونے اس لئے ہیں کہ جو کچھ وہ بے شعوری کے ساتھ کرتے ہیں اسی کو انسان شعور کے ساتھ کرنے لگے، جو کچھ وہ "جبر" کے تحت انجام دیتے ہیں اسی کو انسان "اختیار" کے تحت انجام دے۔ یہی انسان کا امتحان ہے اور یہی وہ مقام ہے جہاں اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ ہونا ہے۔

دھات کے ٹکڑوں کے لئے ان کی معنویت کے مظاہرہ پر کوئی انعام نہیں ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اپنی سمجھ اور ارادہ کے تحت نہیں کر رہے ہیں۔ مگر انسان جب اسی بامعنی کردار کو اپنی سمجھ اور اپنے ارادہ کے تحت انجام دیتا ہے تو وہ خدا کے یہاں بہت بڑے انعام کا مستحق بن جاتا ہے۔ اس کے لئے دنیا میں غلبہ لکھ دیا جاتا ہے اور آخرت میں جنت۔

جانوروں سے پیچھے

جنگلی ہرنوں کو اگر آپ جنگل میں دیکھیں تو وہ ہمیشہ غول کی صورت میں دکھائی دیں گے۔ ہرن، دوسرے اکثر جانوروں کی طرح، کبھی اکیلا نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ اپنی جماعت کے ساتھ رہتا ہے۔ ہرن کی زندگی کا مقصد اگرچہ غذا اور پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکنے کے سوا اور کچھ نہیں۔ مگر جنگل کی دنیا میں ہر وقت چھوٹے جانوروں کو بڑے جانوروں کا ڈر لگا رہتا ہے۔ ہر جانور کو یہ خطرہ رہتا ہے کہ اس سے بڑا جانور اس کو اپنا شکار نہ بنالے۔ اس لئے جنگل کے جانور الگ الگ نہیں رہتے۔ بلکہ غول کی صورت میں زندگی گزارتے ہیں۔ وہ ساتھ چلتے ہیں۔ ساتھ بیٹھتے ہیں۔ ساتھ مل کر اپنے سب کام کرتے ہیں۔ ایسا وہ اس لئے کرتے ہیں کہ کوئی خطرہ پیش آئے تو سب مل کر اس کا مقابلہ کرسکیں۔ وہ نازک موقع پر دشمن کے مقابلہ میں اکیلے نہ رہیں۔ وحشی جانور اپنی ساری وحشت کے باوجود اپنے تحفظ کی خاطر اکٹھا ہوجاتے ہیں۔

جنگل کا ایک جانور جانتا ہے کہ تنہا رہنا گویا اپنے آپ کو اس کے لئے چھوڑ دینا ہے کہ دشمن جب بھی چاہے اس کو اپنا شکار بنالے۔ اس کے برعکس نظم اور اتحاد دشمن کے خلاف مضبوط دیوار ہیں۔ قدرت نے ہر جانور کو یہ سبق فطری طور پر سکھا دیا ہے۔ وہ اس سبق کو پوری طرح اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ وہ جنگل کی غیر محفوظ دنیا میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔

انسان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جس بات کو جانور صرف جبلّی طور پر جانتے ہیں وہ انسان کو عقلی اور شعوری طور پر معلوم ہے۔ مگر بہت کم مثالیں ملیں گی جب کہ انسان نے اس واقفیت کو عملی طور پر پوری طرح استعمال کیا ہو۔ وہ اکثر اس معاملہ میں ناکام ثابت ہوتا ہے۔ انسان، انسان ہونے کے باوجود جنگل کے وحشی جانوروں سے پیچھے ہے۔

انسان کیوں متحد نہیں رہ پاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتحاد ہر شخص سے ایک قربانی مانگتا ہے۔ یہ قربانی کہ فرد اپنی انفرادیت کو اجتماع کے حوالے کردے۔ آدمی اپنی ذات کو اہمیت دینے کے بجائے پورے مجموعہ کو اہمیت دینے لگے۔ یہ انا کی قربانی ہے اور انا کی قربانی کسی آدمی کے لئے سب سے مشکل قربانی ہے۔ آدمی جان کو قربان کرسکتا ہے مگر وہ اپنی انا کو دوسرے کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ انسان کی یہی کمزوری ہے جو ہمیشہ اتحاد و اجتماعیت کی راہ میں حائل ہوجاتی ہے۔ جانور اس معنی میں اپنی کوئی انا نہیں رکھتے۔ کوئی چیز ان کے لئے عزت کا سوال نہیں بنتی، یہی وجہ ہے کہ وہ نہایت آسانی کے ساتھ متحد ہوجاتے ہیں۔ اتحاد کا راز بے انا ہونا ہے۔ جہاں اتحاد نہ ہو سمجھ لیجئے کہ وہاں بے انا انسانوں کا وجود نہیں۔

رسی کا سبق

ایک شخص کے دس لڑکے تھے۔ سب لڑکے تندرست اور ہوشیار تھے اور مل جل کر رہتے تھے۔ اس کی وجہ سے ہر جگہ ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کا ہر کام آسانی سے ہو جاتا تھا۔ کوئی شخص ان کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ اس خاندان کا اتحاد اور اس کی طاقت لوگوں کے درمیان ضرب المثل بن گئی تھی۔

لڑکوں کا باپ بوڑھا ہو کر مرض الموت میں مبتلا ہوا تو اس کو سب سے زیادہ اندیشہ یہ ہوا کہ اس کے بعد اس کے لڑکے باہمی اختلاف کا شکار ہو کر الگ الگ نہ ہو جائیں اور اس طرح اپنے آپ کو کمزور کر لیں۔ سوچتے سوچتے ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اس نے ایک روز تمام لڑکوں کو بلایا اور کہا کہ دیکھو اب میں بہت جلد مر جاؤں گا۔ میں تم لوگوں کو ایک سبق دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم میرے اس سبق کو یاد رکھو گے تو زندگی میں کبھی ناکام نہ ہو گے۔ اس کے بعد اس نے ایک موٹی رسی نکالی اور کہا کہ اس کو توڑ دو۔

ہر ایک نے باری باری کوشش کی۔ مگر پورا زور لگانے کے بعد بھی کوئی اسے توڑ نہ سکا۔ اس کے بعد سب نے مل کر اس کو توڑنے کی کوشش کی۔ مگر اب بھی وہ کامیاب نہ ہوئے۔ اب بوڑھے باپ نے یہ کیا کہ رسی کو کھولا تو اس کی دس لڑیاں الگ الگ ہو گئیں۔ اس نے ایک ایک لڑی ہر لڑکے کو دے کر کہا کہ اسے توڑ دو۔ اب معاملہ آسان تھا۔ ہر لڑکے نے معمولی کوشش سے اپنی اپنی رسی توڑ ڈالی۔ یکجا لڑیوں کو کوئی توڑ نہ سکا۔ مگر منتشر لڑیوں کو ہر ایک نے توڑ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

اس تجربہ کے بعد باپ اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوا۔ اس نے کہا: دیکھو، جب تک رسی کی دس لڑیاں ایک ساتھ ملی ہوئی تھیں، تم لوگ اسے توڑنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مگر وہی رسی جب الگ الگ لڑیوں میں بٹ گئی تو تم میں سے ہر شخص نے بآسانی اسے توڑ ڈالا۔ اسی مثال سے تم اپنا معاملہ سمجھ سکتے ہو۔

تم لوگ دس بھائی ہو۔ گویا یہ رسی کی دس لڑیاں ہیں جو اب تک ایک ساتھ ملی رہی ہیں۔ اس لئے تم لوگ ہر جگہ طاقت ور ثابت ہوتے رہے۔ کوئی تمھارا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ اگر تم لوگ اسی طرح ایک ساتھ ملے رہو گے تو ہرگز کوئی تم کو توڑ نہ سکے گا۔ اور اگر تم الگ الگ ہو گئے تو تمھارے دشمن تم کو اسی طرح ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں گے جس طرح تم نے رسی کی لڑیوں کو الگ الگ ہونے کے بعد توڑ دیا۔

ایک خاندان کا معاملہ ہو یا ایک قوم کا، سب کے لئے طاقت کا سب سے بڑا راز اتحاد ہے۔ وہی تعداد جو اختلاف کے وقت دوسروں کے مقابلہ میں بے زور دکھائی دیتی ہے وہی تعداد اگر متحد ہو جائے تو وہ اتنی طاقت ور ہو جائے گی کہ اس کا حریف اس پر ہاتھ اٹھانے کی ہمت ہی نہ کرے۔

یہ اختلاف کیوں

مباحثہ کی میز کے چاروں طرف کمرہ میں ایک درجن آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایسے موقع پر کوئی موضوع چھیڑا جائے تو اس کے بارے میں لوگوں کی رائیں مختلف ہوجائیں گی۔ ہر آدمی کوئی نیا پہلو نکالے گا اور الگ رائیں دے گا۔ ایک سیدھی بات بھی تشریح وتعبیر کے فرق سے ایک درجن شکلیں اختیار کرلے گی۔ لوگوں کو ایک متفقہ رائے پر لانے کی ہر کوشش ناکام ثابت ہوگی۔ اب اسی کمرہ میں حکومت وقت کا وزیر مالیات داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں مختلف رنگ کی بہت سی گولیاں ہیں۔ ان میں سے ایک گولی سفید ہے۔ وہ اعلان کرتا ہے کہ اس سفید گولی پر ایک ملین ڈالر کا انعام ہے۔ میں اس کو اچھال کر گراؤں گا۔ جو شخص سفید گولی پالے گا اس کو ایک ملین ڈالر نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے بعد جب وہ گولیوں کو میز پر بکھیرے گا تو تمام لوگوں کی توجہ "سفید گولی" پر لگ جائے گی۔ دیکھنے میں اگرچہ وہاں بہت سی گولیاں ہوں گی مگر حاضرین میں سے کوئی نہ ہوگا جو سفید گولی کے سوا کسی اور گولی کی طرف متوجہ ہو۔ اب فرض کیجئے کہ اسی کمرہ میں دوسرا شخص داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بکس ہے۔ وہ اپنا بکس میز پر رکھ کر اس کو کھولتا ہے اور اس کے اندر سے ایک کالا سانپ نکل کر میز پر چلنے لگتا ہے۔ اس کے بعد کمرے کے حاضرین کا جو حال ہوگا اس کا تصور ہر شخص کر سکتا ہے۔ دوبارہ ہر آدمی کی توجہ "سانپ" کے اوپر جم جائے گی۔ ہر آدمی صرف ایک چیز سوچے گا: بھاگ کر اپنے کو سانپ کی زد سے بچائے ——— شدتِ طلب یا شدتِ خوف رایوں کے فرق کو ختم کر دیتا ہے۔ ایسے وقت میں ہر آدمی اسی ایک چیز کا طالب بن جاتا ہے جو سب سے زیادہ قابلِ طلب ہے اور ہر آدمی اسی ایک چیز سے ڈرنے لگتا ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے کے قابل ہے۔ ہر آدمی کی توجہ اسی ایک چیز پر لگ جاتی ہے جس پر دوسرے آدمی کی توجہ لگی ہوئی ہے۔

اس مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ دین کے معاملہ میں آج اتنا زیادہ اختلاف کیوں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دین آج لوگوں کے لئے بس ایک لکھنے اور بولنے کی چیز ہے، وہ ان کے لئے خوف اور محبت کی بنیاد نہیں بنا ہے۔ اگر وہ حقیقی معنوں میں خوف ومحبت کی بنیاد بن جائے تو اچانک سارا اختلاف ختم ہوجائے گا۔ لوگ جنت اور جہنم کا نام لیتے ہیں مگر جنت لوگوں کی ضرورت نہیں بنی اور جہنم لوگوں کا مسئلہ نہیں بنی۔ یہی اختلاف کا سب سے بڑا سبب ہے۔ گویا میز کی سطح پر ایک دینی مباحثہ جاری ہے اور ہر آدمی اس کے گرد بیٹھا ہوا اپنی قابلیت کے جوہر دکھا رہا ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہو کہ جنت لوگوں کی طلب شدید بن جائے اور جہنم سے لوگوں پر خوف شدید طاری ہوجائے تو دفعتہً سب کی رائیں سمٹ کر ایک نقطہ پر جمع ہوجائیں گی۔ سب ایک ہی "انعام" کے طالب بن جائیں گے اور سب ایک ہی "خطرہ" کو سب سے بڑا مسئلہ سمجھنے لگیں گے۔ یہ شدتِ طلب اور یہ شدتِ خوف رایوں کے تعدد کو ختم کر دے گا۔ لوگ سارے اختلافات کو بھول کر اپنی توجہ ایک ہی چیز پر مرتکز کر دیں گے۔ سارے مسلمان مل کر اتحاد کی چٹان بن جائیں گے۔ وہ دین جو "۲۷ دینوں" میں تقسیم ہوتا ہوا نظر آرہا ہے وہ صرف ایک دین کی صورت میں دکھائی دینے لگے گا۔ تمام نیکیوں کی بنیاد یہ ہے کہ آدمی سنجیدہ (Sincere) ہو۔ اور شدتِ طلب اور شدتِ خوف کے سوا کوئی چیز نہیں جو آدمی کو حقیقی معنوں میں سنجیدہ بنا سکے۔

برداشت نہ کرنا

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی سب سے زیادہ عام واحد خصوصیت ہے ——— اختلاف کو برداشت نہ کرنا۔ جہاں بھی دیکھئے، مسلمان آپس میں لڑتے بھڑتے نظر آئیں گے۔ موجودہ حالت میں چونکہ غیروں پر ان کا قابو نہیں چلتا اس لئے ان کا غصہ اکثر اپنوں پر اترتا ہے، وہ دوسروں کے لئے نرم اور اپنے بھائیوں کے لئے سخت بن گئے ہیں۔

مسلمانوں کی اس مزاجی کیفیت کی تصویر آج ساری دنیا میں نظر آرہی ہے۔ جن لوگوں کے پاس قانون کی طاقت ہے وہ قانون کے زور پر اپنے مخالف بھائیوں کو گولی مار رہے ہیں اور ان کے اوپر کوڑے برسا رہے ہیں۔ جن کے پاس قانون کی طاقت نہیں ان کے دو طبقے ہیں۔ ایک جاہل عوام کا، دوسرے خواص کا۔ مسلمانوں کے جاہل عوام کو جب اپنے کسی بھائی سے اختلاف ہو جائے تو وہ چھرے یا لاٹھی ڈنڈے سے اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ خواص اس قسم کا "غیر شریفانہ" طریقہ اختیار نہیں کرتے۔ مگر اپنے مخالف کے اوپر کارروائی کرنے میں وہ کسی سے پیچھے نہیں۔ وہ اس کے بجائے اپنے بھائی کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اس کو اجاڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی اقتصادیات کو برباد کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ زبان و قلم سے اس کو اتنا بدنام کریں کہ اس کا نام ذلت و رسوائی کا نشان بن کر رہ جائے۔

کسی مسلمان کے لئے یہ ناقابل معافی جرم ہے کہ وہ اپنے بھائی کو اپنی طاقت کا مزا چکھائے۔ اس کا قلم اور اس کی زبان اپنے مسلمان بھائی کو بے عزت کرنے میں صرف ہونے لگے۔ اس کا پیسہ اپنے بھائی کو مٹانے اور برباد کرنے کے منصوبوں میں خرچ ہو۔ اس کی طاقت کا یہ مصرف بن جائے کہ اس سے وہ اپنے بھائی کا سر توڑے اور اپنے بھائی کی زندگی کو ویران کرے۔ جو شخص اس قسم کے جرم میں مبتلا ہو بلاشبہ وہ اللہ کے یہاں لعنتی ہے۔ اس کے بعد اس کا کوئی بھی عمل اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ الا یہ کہ وہ توبہ کرے اور اپنے ان جرائم سے باز آجائے۔

دو آدمیوں میں اختلاف پیدا ہونا بجائے خود برا نہیں، بلکہ ایسا ہونا بالکل فطری ہے۔ جو چیز بری ہے وہ یہ کہ اختلاف کے بعد دلوں میں نفرت اور عداوت جاگ اٹھے جس سے اختلاف پیدا ہو اس کے بارے میں آدمی انصاف کے تقاضوں کو بھول جائے۔ وہ اس کے خلاف جارحانہ کارروائی کرنے لگے۔ وہ اپنے بھائی کی جان اور مال اور آبرو کو اپنے لئے حلال کرلے، حالاں کہ اللہ نے ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان اور مال اور آبرو کو حرام کیا ہے۔

سچائی عوامی شور میں دب جاتی ہے

ٹورانٹو (کناڈا) میں ایک مکان میں آگ لگ گئی۔ ایک شخص تیسری منزل پر تھا۔ آگ بجھانے والے (فائربین) آئے۔ انھوں نے پھنسے ہوئے آدمی کو آواز دی کہ تم کھڑکی کے چھجے پر آجاؤ۔ ہم تم کو خصوصی سیڑھی سے اتارنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ مگر فائربین صرف چند تھے۔ دوسری طرف عمارت کے نیچے کافی مجمع اکٹھا ہوگیا۔ مجمع چلانے لگا "کود و کود و"۔ مجمع کے شور میں فائربین کی آواز آدمی تک نہ پہنچ سکی۔ اس نے اپنے کمرہ سے چھلانگ لگادی۔ وہ نیچے گرا تو شدید طور پر زخمی ہو چکا تھا۔ اس کو نازک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا۔ فائربین نے کہا: آدمی اگر ۳۰ سکنڈ اور ٹھہرا ہوتا تو ہماری سیڑھی اس تک پہنچ جاتی اور وہ بحفاظت نیچے اتر آتا۔ آدمی کی عمر اکیاون سال تھی اور اس کا نام فرینک کرٹس (Frank Curtis) تھا (ٹائمس آف انڈیا ۵ جنوری ۱۹۸۰)

لوگ بولنا جانتے ہیں۔ مگر زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ لوگ چپ رہنا جانیں۔ وہی گروہ ترقی کرتا ہے جس کے افراد یہ جانتے ہوں کہ ان کو کہاں چپ رہنا چاہئے۔ جب لوگ چپ رہتے ہیں تو در اصل وہ اہل تر کو بولنے کا موقع دیتے ہیں۔ اور جب ہر شخص بولنے لگے تو اس کے بعد یہ ہوگا کہ جو شخص حقیقی معنوں میں بولنے کا اہل ہے وہ بولنے کو بے فائدہ سمجھ کر چپ ہو جائے گا یا اگر بولے گا تو عوامی شور وغل میں اس کی آواز دب کر رہ جائے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ حال تھا کہ جب آپ صحابہ کو اکٹھا کرتے اور ان کے سامنے مشورہ کے لئے کوئی بات رکھتے تو لوگ غور سے بات کو سن کر چپ ہو جاتے۔ کیوں کہ ہر آدمی اپنا بے لاگ محاسبہ کرنے کی وجہ سے اس بات کو جانتا تھا کہ اس کے درمیان بولنے کا سب سے زیادہ اہل، رسول خدا کے بعد، جو شخص ہے وہ ابوبکرؓ ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مکمل ہو جانے کے بعد سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ بولتے۔ پھر دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائے دیتے اور اس کے بعد ہر آدمی طے شدہ عمل کے لئے تیار ہو جاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب خلافت راشدہ کا دور شروع ہوا تو اب یہ ہوا کہ خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ لوگوں کو مشورہ کے لئے جمع کرتے۔ آپ اپنی بات کہہ کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ لوگو اپنی رائے بتاؤ۔ مگر دوبارہ سب لوگ چپ رہتے۔ کیوں کہ یہ وہ لوگ تھے جو اللہ سے ڈرنے والے تھے۔ ان کے ڈر نے ان کو بتا دیا تھا کہ ان کے درمیان بولنے کے سب سے زیادہ اہل عمر بن خطابؓ ہیں۔ چنانچہ خاموشی کے ایک وقفہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہوتے اور اپنی بات کہتے۔ آپ کی بات مکمل ہو جاتی تو دوسرے لوگ مختصراً اپنی رائیں ظاہر کرتے اور پھر اتفاق رائے سے فیصلہ ہو جاتا۔

بعد کے زمانہ میں یہ صورت حال دھیرے دھیرے بدل گئی۔ اب ہر شخص اپنے آپ کو سب سے زیادہ بولنے اور رائے دینے کا اہل سمجھنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملت اسلامی میں ایسا خلفشار برپا ہوا جو کبھی ختم نہ ہو سکا۔ موجودہ زمانہ میں بھی یہ صورت حال مزید شدت کے ساتھ قائم ہے۔ آج ہر آدمی لکھنے اور بولنے کے لئے بے تاب نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسائل پر رائے دینے کا سب سے زیادہ اہل وہی ہے۔ لوگوں کو اپنا وجود حقیقت سے زیادہ دکھائی دیتا ہے اور دوسرے کا وجود حقیقت سے کم نظر آتا ہے۔ کوئی اپنی نااہلی کو نہیں جانتا۔ البتہ اپنی اہلیت کو جاننے کا ماہر ہر شخص بنا ہوا ہے۔ موجودہ زمانہ میں ملت کے اختلاف اور کمزوری کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے۔

قومی ترقی کا راز

قدرت کا یہ قانون ہے کہ مقناطیسی میدان اور حرکت کو یکجا کیا جائے تو وہاں جتنے تار ہوں گے سب میں الکٹران دوڑنے لگیں گے۔ جنریٹر اسی قانون قدرت کو استعمال کر کے بجلی پیدا کرتا ہے۔ اب اگر ایسا ہو کہ جنریٹر چالو کرنے کے بعد کسی تار میں الکٹران دوڑیں اور کسی تار میں نہ دوڑیں تو سارا تمدنی نظام درہم برہم ہو جائے۔ کیونکہ پھر بجلی پیدا کرنے کا عمل رک جائے گا۔ اور جب بجلی پیدا نہ ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری تمدنی مشین ٹھپ ہو کر رہ جائے گی۔

ایک چرواہا سیکڑوں بھیڑ بکریوں کو لے کر پہاڑ کی گھاٹیوں میں چراتا ہے۔ بکریاں چرتے چرتے اونچی نیچی کھائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ مگر جب لوٹنے کا وقت آتا ہے تو چرواہا ایک جگہ کھڑا ہو کر آواز دیتا ہے اور اور اس کی ایک آواز پر تمام بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ سے نکل کر آواز کی طرف چل پڑتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں گلہ تیار ہو جاتا ہے اور چرواہا ان کو لے کر اپنے ٹھکانے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اگر ایسا ہو کہ چرواہے کی آواز کے باوجود بھیڑ بکریاں اپنی اپنی جگہ بہری بن کر پڑی رہیں تو چرواہی اور گلہ بانی کا کام کرنا غیر ممکن ہو جائے۔

یہی اصول قوموں کے معاملہ میں بھی ہے۔ کسی قوم کی ترقی کا راز یہ ہے کہ کوئی فکر اس کے افراد میں اس طرح اتر جائے کہ وہ پوری قوم کو متحرک کر سکے۔ گستاولی بان نے عربوں کا تاریخی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسانی ترقی کا سب سے بڑا سبب کسی ایک تخیل کی پرستش ہے۔ یہ تخیل خواہ کوئی بھی ہو، اس قدر کافی ہے کہ وہ اتنا قوی ہو کہ قوم میں متحدہ احساس اور متحدہ امید پیدا کر دے۔ اور قوم کے ہر فرد کا اعتقاد اس کی نسبت اتنا زور آور ہو کہ وہ اس کے لئے اپنی جان دینے پر آمادہ ہو جائے۔ رومیوں کا تخیل شہر روم کی ترقی تھی۔ عیسائیوں کا تخیل عقبیٰ کا آرام حاصل کرنا تھا۔ موجودہ زمانہ میں بھی انسان نے نئے نئے معبود بنا لئے ہیں جو یقیناً فرضی ہیں مگر ان کے لئے وہ اتنے ہی مؤثر ہیں جتنا قدیم قوموں کے لئے ان کے معبود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی تاریخ محض ان حوادث کی ایک سرگزشت ہے جن کو انسان نے کسی تخیل کی تلاش میں طے کیا ہے۔ اگر یہ تخیل نہ ہوتا تو انسان ابھی تک وحشیانہ حالت میں ہوتا اور کسی قسم کا تمدن قائم نہ کر سکتا۔ قوم کا تنزل اسی دن سے شروع ہو جاتا ہے جس دن اس کے پاس کوئی ایسا تخیل نہ رہے جس کی حفاظت کے لئے ہر ایک فرد قوم اپنی جان دینے پر آمادہ ہو۔

عربوں نے ملک کے ملک فتح کئے۔ انھوں نے پہلے حکومت یونان و روم کے جانشینوں سے شکست کھائی۔ مگر وہ بالکل ہمت نہ ہارے۔ انھوں نے انھیں حریف قوموں سے فنون جنگ کو سیکھا۔ جب وہ فن جنگ میں ان کے برابر ہو گئے تو پھر وہ برابر کامیاب ہوتے رہے۔ ہر عرب سپاہی اس تخیل پر اپنی جان قربان کرنے کے لئے تیار تھا جس کے سایہ میں وہ لڑ رہا تھا۔ اس کے برعکس یونانیوں اور رومیوں کی فوج میں سارا جوش، سارا ولولہ اور سارے اعتقادات مدت دراز سے مر چکے تھے (تمدن عرب ۳۰ ـ ۶۲۹)

اتحاد کی آسان تدبیر

گاؤں کا ایک خاندان ہے۔ باپ کا انتقال ہو چکا ہے۔ چار بھائی اور ان کے بیوی بچوں کو ملا کر ڈیڑھ درجن افراد خاندان ہیں۔ مگر سب مل کر رہتے ہیں۔ آپس میں جھگڑا نہیں ہوتا۔ ان کا اتحاد و اتفاق ساری بستی میں ضرب المثل بن گیا ہے۔ میری ملاقات ان کے بڑے بھائی سے ہوئی تو میں نے پوچھا: "آپ کے یہاں جھگڑا نہیں ہوتا، یہ بہت اچھی بات ہے۔ مگر اس کا راز کیا ہے" انھوں نے جواب دیا "ایسا نہیں ہے کہ جھگڑا نہیں ہوتا۔ اتنے سب آدمی جس گھر میں ہوں وہاں کچھ نہ کچھ کھٹ پٹ ہونا ضروری ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگ اس کو بڑھنے نہیں دیتے" اس کے بعد وہ اٹھے اور ایک طرف دس قدم چل کر گئے اور کہا "جب جھگڑا ہوتا ہے تو ہم اس طرح اس سے ہٹ کر دور چلے جاتے ہیں" یہ ایک معمولی پڑھا لکھا خاندان ہے۔ مگر انھوں نے زندگی کا ایک راز پا لیا ہے۔ وہ یہ کہ جھگڑا ایک وقتی چیز ہے۔ اگر اس کو کسی طرح ٹال دیا جائے تو وہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ اس اصول پر وہ لوگ شدت سے کاربند ہیں اور اس کے زبردست فوائد ان کو حاصل ہوئے ہیں۔ باپ کے انتقال کے وقت ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی۔ مگر اپنے اتحاد و اتفاق کے ذریعہ انھوں نے گاؤں میں مثالی ترقی حاصل کر لی۔ اب انھوں نے اپنے معاملات کے چار شعبے کر دئے ہیں اور چاروں بھائی ایک ایک شعبہ پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک بھائی کھیتی کا ذمہ دار ہے، دوسرا بھائی دکان کا ذمہ دار ہے۔ تیسرا بھائی گھر کے امور کا ذمہ دار ہے، چوتھا بھائی باہر کے امور کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ کاموں کی تقسیم نے ان کے لئے باہمی اختلاف کے مواقع اور بھی کم کر دئے ہیں۔

اسی طرح میری ملاقات ایک بار دو ایسے آدمیوں سے ہوئی جو دو الگ الگ پارٹیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے باوجود دونوں بہت قریبی دوست تھے۔ روزانہ باہم ملتے اور ایک دوسرے کے کام میں شریک رہتے۔ میں نے پوچھا کہ آپ لوگوں میں سیاسی اختلاف کے باوجود اس قدر اتحاد کیسے ہے۔ ان میں سے ایک شخص نے مسکرا کر جواب دیا: "ہم نے اپنے اختلاف کو بازو میں رکھ دیا ہے"۔ ان کی زبان سے یہ جملہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ ایک بہت بڑے مسئلہ کا کتنا سادہ حل انھوں نے دریافت کر لیا تھا ہمارے بستر میں ایک کانٹا ہو تو ہم اس کو بستر سے نکال کر "بازو" میں ڈال دیتے ہیں۔ یہی طریقہ اختلاف کے بارے میں کیوں نہ اختیار کیا جائے۔ دو آدمیوں میں کوئی اختلاف ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ان کے درمیان سارے معاملات میں اختلاف ہو گیا۔ اختلاف کے باوجود بہت سے دوسرے امور ہوتے ہیں جن میں دونوں کے درمیان پورا اتفاق ہوتا ہے۔ اس لئے بہترین عقلمندی یہ ہے کہ دو آدمیوں میں جب اختلاف پیدا ہو تو اختلاف کے پہلو کو "بازو" میں رکھ کر اتحاد کے پہلوؤں پر اپنا جوڑ باقی رکھا جائے۔ اسی طرح ایک بار میں ایسے دو آدمیوں سے ملا جو بالکل متضاد سیاسی خیالات رکھتے تھے۔ ایک کا تعلق ایک فرقہ وارانہ جماعت سے تھا اور دوسرے کا تعلق ایک قومی جماعت سے۔ اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے اور بے تکلفی کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ نظریاتی اختلاف کے باوجود آپ لوگ اپنے ان تعلقات کو کس طرح نبھاتے ہیں۔ یہ سن کر ان میں سے ایک شخص نے جواب دیا: ہم نے اس بات پر اتفاق کر لیا ہے کہ ہمارے درمیان اختلاف ہے ——

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ زندہ انسان اختلاف کے اندر بھی اتحاد کے اسباب ڈھونڈ لیتے ہیں۔

اختلاف کے باوجود

"مجھے اپنی زندگی کے دو واقعات یاد آتے ہیں"، مولانا عبدالرحیم بڈیڈوی (ہریانہ) نے کہا۔ ۵۳-۱۹۵۲ میں جب کہ میں مدرسہ سبحانیہ دہلی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ میرے ساتھ یوپی کے ایک طالب علم عبدالقیوم صاحب رہتے تھے۔ وہ اپنے روپے میرے پاس امانتاً رکھتے تھے جن کو میں ان کی اجازت سے خود اپنی ضرورت کے لئے بھی استعمال کرتا تھا۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ کسی بات پر ان سے میری لڑائی ہوگئی۔ عبدالقیوم صاحب کے دوستوں نے ان کو اکسایا کہ "عبدالرحیم نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے تم ان سے اپنا سب روپیہ مانگ لو۔" لوگوں نے بہت کہا مگر وہ اس کے لئے راضی نہ ہوئے۔ انھوں نے کہا: ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ لڑائی الگ چیز ہے اور روپیہ الگ چیز۔ میں لڑائی کی وجہ سے ان سے اپنے روپیہ کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔

دوسرا واقعہ میوات کا ہے۔ ۱۹۵۹ میں میں گلپاڑہ (ضلع بھرت پور) کے مدرسہ میں تدریسی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہاں کے ایک میو حاجی دراب خاں سے میری اکثر لڑائی رہتی تھی۔ اسی دوران میں ایک بار مدرسہ کے لئے چندہ کی مہم چلی۔ کچھ لوگ گھوم کر گاؤں کے ایک ایک گھر تک پہنچے اور مدرسہ کی امداد کے لئے کہا۔ کسی نے ۲۰ سیر اناج لکھوایا، کسی نے ۳۰ سیر۔ سب سے زیادہ جس نے لکھوایا وہ ایک من غلہ تھا۔ میں بھی وفد میں شامل تھا۔ لوگ حاجی دراب خاں کے گھر کی طرف چلے تو مجھے ایسا لگا کہ یہ لوگ بے کار ان کے یہاں جا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے مدرسہ کے ساتھ کب تعاون کریں گے جس میں ان کا ایک مبغوض شخص کام کرتا ہو۔ ہم لوگ ان کے گھر پہنچے اور مدرسہ کے لئے کہا۔ انھوں نے پوچھا کہ لوگوں نے کتنا کتنا لکھوایا ہے۔ ہر ایک کی مقدار بتائی گئی جس میں سب سے زیادہ اس کا غلہ تھا جس نے ایک من لکھوایا تھا۔ انھوں نے کہا "میری طرف سے سوا من لکھ لو۔" اس کے بعد بولے: اگرچہ میری اس مولوی سے لڑائی ہے۔ مگر مدرسہ سے میری کوئی لڑائی نہیں۔ مولوی سے لڑائی کے باوجود میں مدرسہ کی مدد کروں گا۔

زندہ آدمی اختلاف کو اسی دائرہ میں رکھتا ہے جس دائرہ میں اختلاف پیدا ہوا ہے، اس سے باہر اس کو نہیں لے جاتا۔ کسی سے ذاتی اختلاف ہو تو اس کی بنا پر اس کے ادارہ کی جڑ کھودنے کے درپے نہیں ہوتا۔ کسی سے ایک مسئلہ میں اختلاف ہو تو اس کو سارے مسائل میں اپنا مخالف نہیں سمجھ لیتا۔ کسی سے نظریاتی اختلاف ہو تو اس کی وجہ سے ایسا نہیں کرتا کہ اس کو بے عزت کرے یا اس کی معاشیات کو برباد کرنے لگے۔ زندہ آدمی حد کے اندر رہنے والا ہوتا ہے نہ کہ حد سے گزر جانے والا۔

غصہ چھوڑ دیا

عرفان احمد صاحب بے حد غصہ ور آدمی تھے۔ وہ جب گھر کے اندر داخل ہوتے تو تمام لوگ سہم جاتے۔ ان کی ماں، ان کی بہنیں، ان کے چھوٹے بھائی سب اس خوف میں رہتے کہ کب کس کے اوپر برس پڑیں گے۔ کھانے پینے میں کوئی چیز خلاف مزاج ہوتی تو اس قدر بگڑ اٹھتے کہ برتن اٹھا کر پھینک دیتے۔ ان کے روز روز کے غصہ کی وجہ سے گھر کی فضا اس قدر خراب ہو گئی تھی کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی گھر کے اندر کسی کو چین حاصل نہ تھا۔

ایک روز وہ اپنے کمرہ میں بیوی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ آج وہ کسی بات پر کافی خوش تھے۔ ان کو خوشی کی کیفیت میں دیکھ کر بیوی نے کہا: آپ جانتے ہیں کہ میں نے کبھی آپ سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ عرفان احمد صاحب نے کہا، ہاں بیگم تم صحیح کہتی ہو، تم نے کبھی خود سے کسی چیز کی فرمائش نہیں کی۔ بیوی نے دوبارہ کہا: آج میں پہلی بار آپ سے ایک چیز مانگنا چاہتی ہوں، کیا آپ مجھے وہ چیز دے دیں گے۔ عرفان احمد صاحب پر بیوی کی اس بات کا بہت اثر پڑا۔ انھوں نے کہا، آج تم جو بھی مانگو میں دوں گا، حتیٰ کہ اگر تم جان مانگو تو وہ بھی نکال کر پیش کر دوں گا۔ بیوی نے کہا، نہیں آپ نہیں دیں گے۔ عرفان احمد صاحب نے جذباتی انداز میں کہا: تم مانگو تو، دیکھو میں ابھی دیتا ہوں یا نہیں۔ اس کے بعد بیوی نے کہا:

میں آپ سے کچھ اور نہیں مانگتی۔ بس یہ مانگتی ہوں کہ آپ غصہ کرنا چھوڑ دیں۔

عرفان احمد صاحب کو اس جملہ نے اس قدر متاثر کیا کہ وہ بالکل ڈھ گئے۔ انھوں نے اسی وقت اپنے دونوں کان پکڑے اور کہا کہ جاؤ، میں نے آج سے غصہ چھوڑ دیا۔

اس واقعہ کو دس سال گزر چکے ہیں اور اب عرفان احمد صاحب بالکل دوسرے انسان ہیں۔ وہ گھر میں ہر ایک سے محبت کے ساتھ بولتے ہیں۔ معاملات میں مشورہ کرتے ہیں۔ جو کھانا بھی سامنے آئے اس کو خوشی سے کھا لیتے ہیں۔ وہ خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کرتے ہیں نہ یہ کہ ایک ایک بات پر برہم ہو جائیں۔

یہ تبدیلی خود عرفان احمد صاحب کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ اب ان کی صحت پہلے سے بہت بہتر ہے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ کام کرنے لگے ہیں۔ گھر کے باہر صاحب معاملہ افراد سے ان کا سلوک بہت اچھا ہو گیا ہے۔ ان کا کاروبار بھی اب بہت بڑھ گیا ہے۔ وہ رات کو سکون کے ساتھ سوتے ہیں، جب کہ اس سے پہلے ان کا حال یہ تھا کہ رات بھر بے تابی کے ساتھ کروٹیں بدلتے رہتے تھے۔

اور کہہ لیجئے

ایک مولوی صاحب ایک مسلمان وکیل سے ملنے گئے۔ بات چیت کے دوران وکیل کی زبان سے کوئی ایسا فقرہ نکل گیا جو مولوی صاحب کے روایتی دینی ذوق کے خلاف تھا۔ وہ وکیل کے اوپر بگڑ گئے۔ اس کو بدتمیز، دہریہ وغیرہ سب کچھ کہہ ڈالا۔ وکیل بالکل خاموشی کے ساتھ مولوی صاحب کی باتیں سنتا رہا۔ جب وہ چپ ہوئے تو وکیل نے مسکرا کر کہا:

اور کہہ لیجئے جو کچھ کہنا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔

وکیل کی زبان سے یہ جملہ سن کر مولوی صاحب اچانک بالکل نرم پڑ گئے۔ ان کا سارا جوش جاتا رہا۔ وکیل کے ایک ٹھنڈے جملہ نے مولوی صاحب کی غصہ کی آگ کو بالکل بجھا دیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ بالکل دوسری فضا میں ہوئی۔ ایک ملاقات جس کا آغاز ناخوشگوار کلمات کے ساتھ ہوا تھا وہ بالآخر نہایت خوش گوار فضا میں ختم ہوئی۔

معاشرتی زندگی میں اکثر جھگڑے کسی معمولی بات پر شروع ہوتے ہیں۔ کسی کی ایک بات سے ہمارے نفس کو دھکا لگتا ہے، ہمارے اندر انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ہم اس آدمی سے لڑ پڑتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ معاف کر دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔ کسی کی بیہودہ حرکت پر اگر آدمی چپ رہ جائے تو اس کو ایک ایسی خوشی حاصل ہوتی ہے جو تمام خوشیوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے حریف کو ایک ایسی کسک میں مبتلا کر دیتا ہے جو زندگی بھر اس کا پیچھا کئے رہتی ہے، وہ اس کے اوپر ایسا مسلط ہوتی ہے کہ کبھی اس سے جدا نہیں ہوتی۔

اکثر لوگ صرف یہ جانتے ہیں کہ کوئی شخص زیادتی کرے تو "اینٹ کا جواب پتھر سے" دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور آئندہ وہ اور بھی زیادہ بری حرکتیں کرے گا۔ مگر یہ بات سراسر بے بنیاد ہے۔ جوابی کارروائی نہ کرنے سے اگر یہ اندیشہ ہے کہ آدمی کا حوصلہ بڑھے گا تو جوابی کارروائی کرنے میں اس سے بھی زیادہ بڑا اندیشہ یہ ہے کہ اس کے اندر انتقامی آگ بھڑک اٹھے اور وہ انتقامی جذبہ میں اندھا ہو کر پہلے سے بھی زیادہ بڑی بیہودگی پر اتر آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ معاف کرنا یا نظر انداز کر دینا خود ایک کارروائی ہے۔ معاف کرنے والا آدمی خود بدلہ نہ لے کر خدا کو اپنی جگہ کھڑا کر دیتا ہے، وہ فطرت کو بروئے کار آنے کا موقع دیتا ہے۔ اور یقیناً یہ صورت خود بدلہ لینے سے کہیں زیادہ مؤثر ہے۔

میں چھوٹا کیوں بنوں

ایک گھر میں میاں بیوی کا جھگڑا تھا۔ خاندان کے ایک بزرگ ان کے یہاں گئے تاکہ دونوں میں میل ملاپ کرادیں۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد انھوں نے پایا کہ جھگڑے کی اصل جڑ یہ ہے کہ "گھر کا بڑا کون ہو"۔ شوہر چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے اور بیوی چاہتی ہے کہ میری بات چلے۔ بس یہی مزاج سارے جھگڑے کا سبب ہے۔

انھوں نے بیوی سے باتیں کیں تو اس نے جھلا کر کہا "وہ ہر بات میں اپنی چلاتے ہیں، میری کچھ سنتے ہی نہیں" بزرگ نے کہا کہ جب اتنی سی بات ہے تو تم اپنے شوہر کو بڑا مان لو سارا جھگڑا خود بخود ختم ہو جائے گا" بیوی نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، پھر تو میں مستقل طور پر احساس کمتری کا شکار ہو جاؤں گی"۔ بزرگ نے کہا کہ تم دونوں کے روزانہ کے جھگڑوں کی وجہ سے بچے تباہ ہو رہے ہیں۔ گھر کا سارا معاملہ بگڑا ہوا ہے۔ پھر اگر ان کو بڑا مان لینے سے تمھارے خاندان کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو اس میں کیا برائی ہے۔" بیوی نے کہا: یہی بات آپ ان سے کہئے۔ وہی کیوں نہ مجھ کو بڑا مان لیں"۔

بزرگ نے جب یہ جواب سنا تو وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے کہا: مشترکہ زندگی کا راز چھوٹا بننے میں ہے۔ دس آدمیوں کے درمیان جب نو آدمی اپنے کو چھوٹا بنالیں تبھی یہ ممکن ہوتا ہے کہ دسواں آدمی بڑا بن کر ان کے اندر نظم اور اتحاد قائم کرے۔ جہاں ہر آدمی بڑا بننا چاہتا ہو وہاں نظم اور اتحاد پیدا ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اور جہاں نظم اور اتحاد نہ ہو وہاں جو چیز جنم لیتی ہے وہ صرف بربادی ہے۔ نو آدمیوں کی قربانی سے دس کے دس آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور جہاں کوئی قربانی دینے کے لئے تیار نہ ہو وہاں سارے کے سارے دس آدمی برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔

چھوٹا بننے پر راضی نہ ہونے کا ذہن ہی تمام برائیوں کا اصل سبب ہے۔ آدمی چھوٹا بننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ حالاں کہ موت ہر روز یہی سبق دے رہی ہے۔ موت بہت تیزی سے ہر آدمی کو یہ بتانے کے لئے چلی آرہی ہے کہ تم چھوٹے کے سوا اور کچھ نہیں۔

اپنے اندر کے ایک شخص کو بڑا مان کر اس کے مقابلہ میں چھوٹا بننے پر راضی ہو جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پورا گروہ منظم اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ آدمی انفرادی بڑائی کھو کر زیادہ بڑے پیمانہ پر اجتماعی بڑائی حاصل کر لیتا ہے۔ مگر کوئی شخص اس راز کو نہیں جانتا۔ وہ چھوٹی بڑائی کے احساس میں گم رہتا ہے یہاں تک کہ موت اس کو ہمیشہ کے لئے چھوٹا بنا کر قبر کی تاریکی میں دھکیل دے۔

آدمی نہ کہ گروہ

حافظ حامد حسن علوی (۱۹۵۹-۱۸۷۲) اعظم گڑھ کے ایک صاحب طریقت بزرگ تھے۔ ان کو جماعت اسلامی سے سخت اختلاف تھا۔ حافظ صاحب قبلہ کی بستی میں ایک دینی مدرسہ تھا۔ ایک صاحب اس مقامی مدرسہ میں استاد تھے۔ وہ جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ تاہم اسی کے ساتھ وہ تصوف سے دلچسپی رکھتے تھے اور کبھی کبھی حافظ صاحب کی مجلس میں شریک ہوتے تھے۔

مذکورہ استاد نے ایک روز حافظ صاحب قبلہ سے کہا کہ میں تصوف کے طریقے کا عملی تجربہ کرنا چاہتا ہوں، آپ مجھے اپنی بیعت میں لے لیں اور مجھے اس سلسلہ میں استفادہ کا موقع دیں۔ حافظ صاحب مرحوم اس وقت کافی ضعیف ہو چکے تھے اور بیعت و ارشاد کا کام اپنے خلفاء کے حوالے کر دیا تھا۔ جب ان کے سامنے مذکورہ استاد کی درخواست آئی تو انھوں نے اپنے ایک خلیفہ (مولانا سعید احمد صاحب) کو بلایا اور ہدایت کی کہ ان کو اپنے حلقہ میں لے لو اور ان کو تصوف کی تعلیم دو۔

مولانا سعید احمد صاحب کو مذکورہ استاد کے جماعتی تعلق کا حال معلوم تھا۔ چنانچہ ان کو تکلف ہوا۔ انھوں نے کہا "حضرت، یہ تو جماعت اسلامی کے رکن ہیں" حافظ صاحب قبلہ نہایت ذہین اور بیدار مغز آدمی تھے۔ انھوں نے اپنے مخصوص لہجہ میں کہا:

اجی، آدمی دیکھا جاتا ہے کہ جماعت

انھوں نے مولانا سعید احمد صاحب سے کہا کہ تم ان کو اپنے حلقہ میں شامل کر لو اور ان کو تصوف کی تعلیم دو۔ دیکھنے کی چیز شخص ہوتا ہے، جماعت یا گروہ نہیں۔ چنانچہ جماعتی اختلاف کے باوجود مذکورہ استاد کو حلقہ تصوف میں شامل کر لیا گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر آدمی کا ایک الگ سانچہ ہوتا ہے۔ یہ سانچہ ہر حال میں باقی رہتا ہے، خواہ وہ کسی بھی جماعت یا کسی بھی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ دانش مندی یہ ہے کہ کسی فرد سے معاملہ کرتے ہوئے اس کی انفرادی شخصیت کو دیکھا جائے نہ کہ جماعت اور حلقہ کو۔ جو لوگ حلقہ اور جماعت کی اصطلاحوں میں سوچیں وہ اکثر نہایت قیمتی افراد کو کھو دیتے ہیں۔ وہ فرد کو جماعت یا گروہ کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ حالاں کہ فرد ہمیشہ فرد رہتا ہے۔ وہ جماعت میں شریک ہونے کی وجہ سے جماعت نہیں بن جاتا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ہجرت کے سفر میں عبداللہ بن اریقط کو راز دار بنایا گیا جو کہ مشرک تھا۔ مگر مشرک ہونے کے باوجود اس نے راز کی پوری حفاظت کی۔ دوسری طرف فتح مکہ کی تیاری کے موقع پر ایک مسلمان حاطب بن ابی بلتعہ نے خط کے ذریعہ مدینہ کے فوجی راز کو مکہ والوں تک پہنچانے کی کوشش کی۔ اگرچہ خدائی اطلاع کی بنا پر ان کا قاصد راستہ میں پکڑ لیا گیا۔

زندگی کا راز: باہمی اتفاق

"مملکت عربیہ سعودیہ" ابتداءً ۱۹۰۲ میں قائم ہوئی۔ عرب ممالک میں عام طور پر بہت جلد جلد حکومتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مگر سعودی حکومت کسی انتشار کے بغیر قائم ہے۔ اس کی اس کامیابی کا راز اتحاد ہے۔ چند ماہ پہلے امریکہ کی سی آئی اے نے اپنی حکومت کو ایک رپورٹ دی۔ اس رپورٹ میں "انکشاف" کیا گیا تھا کہ سعودی عرب کے شاہی خاندان میں اندرونی اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے بعد ایک مغربی سفیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے ایک سعودی شہزادہ نے کہا:

If there is one thing this royal family is agreed on, it is its own survival. We do not survive by fighting each other.

اگر کوئی چیز ہے جس پر سعودی عرب کا شاہی خاندان متفق ہے تو یہ اس کا اپنے وجود کو باقی رکھنا ہے۔ اگر ہم آپس میں لڑیں تو ہم اپنے وجود کو باقی نہیں رکھ سکتے۔ (ٹائمس آف انڈیا ۳ نومبر ۱۹۷۹)

زندگی کا یہ راز جس کو عرب کے شاہی خاندان نے جان لیا اگر مسلم قومیں بھی اس کو جان لیں تو مسلم دنیا اچانک اتنی طاقت ور ہو جائے کہ وہ تمام مسئلے خود بخود حل ہو جائیں جن کے لئے قربانیوں پر قربانیاں دی جارہی ہیں اور وہ کسی طرح حل ہونے میں نہیں آتے۔ کسی مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے تو مسلمان بار بار متحد ہو جاتے ہیں۔ مگر اسلام کے احیاء اور ملت کی تعمیر کے لئے ان میں اتحاد نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ وہ اتحاد جو مفروضہ دشمن کو ہٹانے کے لئے بہت بڑے پیمانہ پر وجود میں آگیا تھا وہ دشمن کے ہٹتے ہی اچانک ختم ہو جاتا ہے۔ مثبت مقصد کے لئے جب اتحاد نہ ہو سکے تو منفی مقاصد کے لئے اتحاد کی کوئی قیمت نہیں۔ اس قسم کا اتحاد مرض کی علامت ہے نہ کہ صحت مند ہونے کی علامت۔ اگر اصل مقصد "اسلام" کو کرسی پر بٹھانا ہو تو کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوگا۔ "دشمن اسلام" کے ہٹتے ہی لوگ متفقہ طور پر اسلام کو کرسی پر بٹھا کر اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں لگ جائیں گے۔ مگر جب ہر شخص اپنے کو کرسی پر بٹھانا چاہے تو اختلاف پیدا ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ کرسی تو ایک ہی ہے۔ پھر سارے لوگ بیک وقت اس پر کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ جاہ طلبی اختلاف پیدا کرتی ہے اور اسلام طلبی اتحاد۔

کسی گروہ میں اتحاد نہ ہو تو اس کی وجہ ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کی سطحیت ہوتی ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے مفادات کو بچانے کی خاطر بڑی اجتماعیت کا جزء نہیں بنتے۔ دس چھوٹے حلقے ہوں تو دس آدمیوں کو صدارت حاصل ہوگی۔ اور اگر ان کو ملا کر ایک حلقہ بنا دیں تو صرف ایک شخص عہدہ حاصل کر سکے گا۔ اس لئے جاہ طلب لوگ اتحاد میں شامل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح کچھ افراد عرصہ تک ایک حلقہ سے جڑے رہیں تو بالآخر ان کے اندر عصبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنی ہر چیز کے حق میں وہ ایک قسم کا تقدس محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ایسے لوگ اپنے حلقہ کو عظیم تر اجتماعیت میں ملانے کو ایسا ہی خیال کرنے لگتے ہیں جیسے مقدس کعبہ کو کوئی اپنے ذاتی مکان میں شامل کرنے کی کوشش کرے۔ پھر جو لوگ کسی حلقہ سے وابستہ نہ ہوں ان کی رکاوٹ کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اجتماعیت کو اپنی آزاد زندگی کے لئے بندھن محسوس کرتے ہیں —— اتحاد بہت بڑی طاقت ہے۔ مگر اتحاد ہمیشہ ذات کی نفی کی قیمت پر قائم ہوتا ہے۔ اور قربانی کی یہ قسم ہمیشہ انسان کے لئے سب سے زیادہ مشکل چیز رہی ہے۔

ذاتی رنجش سے بلند ہوکر

امریکہ کے سابق وزیر خارجہ ڈاکٹر ہنری کسنجر کی ایک کتاب چھپی ہے۔ اس کا نام ہے وھائٹ ہاؤس کے سال (The White House Years) اس کتاب میں مصنف نے سابق صدر رچرڈ نکسن کا ۱۹۶۹ کا ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ مسٹر نکسن کے صدر منتخب ہونے سے چند ماہ پہلے ایک انگریز مسٹر جان فری مین نے ان پر سخت تنقید کی تھی۔ انھوں نے عوامی طور پر مسٹر نکسن کے بارے میں کہا تھا: مسٹر نکسن ایک ایسے شخص ہیں جن کا کوئی بھی اصول نہیں سوا اس کے کہ وہ اپنی ذات کی خاطر ہر چیز کو قربان کر دینا چاہتے ہیں۔

He is a man of no principle whatsoever except a willingness to sacrifice everything in the cause of Dick Nixon.

عجیب اتفاق ہے کہ مسٹر نکسن جب امریکہ کے صدر منتخب ہوئے تو اس وقت کے برطانی وزیر اعظم مسٹر ہرولڈ ولسن نے انھیں مسٹر فری مین کو امریکہ میں برطانی سفیر نامزد کیا۔ مسٹر نکسن کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ انھوں نے مسٹر ولسن کو پیغام بھیجا کہ وہ کسی دوسرے شخص کو اپنا سفیر مقرر کریں جو امریکہ کی نئی حکومت کے لئے زیادہ قابل قبول ہو۔ مگر مسٹر ولسن نے اس تجویز کو نہیں مانا۔ اس میں مزید ناگواری اس وقت پیدا ہوئی جب مسٹر نکسن نے صدر امریکہ کی حیثیت سے برطانیہ کا دورہ کیا۔ ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ (برطانوی وزیر اعظم کی سرکاری قیام گاہ) میں مسٹر نکسن کے اعزاز میں ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے شرکار کی فہرست میں مذکورہ مسٹر فری مین کا نام بھی تھا۔ مسٹر نکسن نے سختی سے چاہا کہ ان کا نام فہرست سے خارج کر دیا جائے۔ مگر ان کی یہ خواہش بھی برطانی وزیر اعظم نے پوری نہ کی۔ یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ ڈنر میں جب مسٹر نکسن جام صحت نوش کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو بالکل خلاف امید انھوں نے سیدھے مسٹر فری مین کی طرف دیکھا اور کہا: کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہاں ایک نیا نکسن ہے۔ اور وہ حیران ہیں کہ کیا یہاں ایک نیا فری مین ہے۔ میں یہ پسند کروں گا کہ پچھلی یادوں کو ہم ماضی کے خانہ میں ڈال دیں۔ آخر کار وہ ایک نئے ڈپلومیٹ ہیں اور میں ایک نیا سیاست داں ہوں۔ دنیا میں امن قائم کرنے کے لئے دونوں اپنی بہترین کوشش کر رہے ہیں۔

Some say there's a new Nixon. And they wonder if there's a new Freeman. I would like to think that that's all behind us. After all, he is the new diplomat and I am the new statesman, trying to do our best for peace in the world.

ڈاکٹر کسنجر لکھتے ہیں کہ فری مین جو عام طور پر ایک مضبوط آدمی سمجھے جاتے ہیں، یہ سن کر تقریباً رو پڑے۔

The usually impurturable Freeman was close to tears.

مسٹر رچرڈ نکسن نے اپنے آپ کو بدل کر مسٹر فری مین کو بھی بدل دیا تھا۔ اس کے بعد فری مین نکسن کے لئے دوسرے فری مین تھے اور نکسن فری مین کے لئے دوسرے نکسن (۸ مئی ۱۹۸۰)

وہ اپنے خلاف تنقید سن کر بھپر اٹھا

ازرا پاؤنڈ (۱۹۷۲ـ ۱۸۸۵) مشہور امریکی شاعر اور تنقید نگار ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور سے اس کی پہلی ملاقات ۳۰ جون ۱۹۱۲ کو لندن میں ہوئی۔ وہ ٹیگور کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا۔ ٹیگور کی نظم گیتان جلی کا انگریزی ترجمہ چھپا تو توازرا پاؤنڈ (Ezra Pound) نے لکھا کہ ٹیگور کے کلام میں وہ عظمت پائی جاتی ہے جو دانتے کی خصوصیت ہے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ وہ ہم میں سے کسی بھی شخص کے مقابلہ میں زیادہ عظیم ہیں۔

. . . . . . greater than any one of us

ازرا پاؤنڈ نے ٹیگور کی بابت یہ الفاظ مارچ ۱۹۱۳ میں ایک امریکی رسالہ (Fortnightly Review) میں لکھے تھے صرف ایک ماہ بعد ۲۲ اپریل ۱۹۱۳ کو اس نے رسالہ (Poetry) کے ایڈیٹر کے نام ایک خط لکھا جس میں ٹیگور کو فضول (Superfluous) قرار دیا اور کہا کہ ان کے کلام میں صرف بعض پرانی باتوں کی تکرار ہے اور اصل بنگالی زبان میں جو ادبی چاشنی تھی وہ بھی انگریزی ترجمہ میں ختم ہوگئی ہے۔

ٹیگور کے بارہ میں ازرا پاؤنڈ کی رائے میں یہ تبدیلی کیسے آئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ازرا پاؤنڈ نے کالی موہن گھوش کی مدد سے کبیر کی نظموں کا انگریزی ترجمہ شروع کیا۔ یہ ترجمہ کتابی صورت سے پہلے میگزین میں قسط وار چھپا۔ ٹیگور نے اس ترجمہ کو دیکھا تو وہ ان کو بہت ناقص معلوم ہوا۔ انھوں نے اس کے ادبی معیار پر سخت تنقید کی۔ اس تنقید کو پڑھ کر ازرا پاؤنڈ بگڑ گیا اور وہی ٹیگور جس کی بابت وہ اس سے پہلے غیر معمولی تعریفی کلمہ کہہ چکا تھا، اس کی ہجو کرنے لگا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۸ مارچ ۱۹۷۹)

بیشتر انسانوں کے لئے سب سے زیادہ قابل نفرت چیز ان کی اپنی ذات پر تنقید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بیشتر انسانوں کے لئے پرستش کا مرکز ان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور آدمی کی فطرت ہے کہ وہ اپنی پرستش کے مرکز پر تنقید کبھی گوارا نہیں کرتا۔

آدمی جب کسی کی تعریف کرتا ہے تو اکثر حالات میں وہ خود اپنی تعریف کی ایک صورت ہوتی ہے۔ ایک لیڈر جب اسٹیج پر کھڑا ہوتا ہے اور پنڈال میں بھرے ہوئے عوام کے سامنے فیاضانہ الفاظ کا تحفہ پیش کرتا ہے تو دراصل وہ عوام کو ان کے اس عطیہ کا بدلہ دے رہا ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کے تقریری تھیٹر میں جمع ہو کر اس کی شان میں اضافہ کیا۔ ایک شخص جب کسی ایسے شخص کے اعتراف میں قصیدہ پڑھتا ہے جو اس کا حریف نہیں ہے تو یہ دراصل اپنے وسعت ظرف اور اپنی شرافت کے اشتہار کی ایک بے ضرر صورت ہوتی ہے۔ ایک صاحب قلم جب دوسرے صاحب قلم کے تذکرہ میں الفاظ کے پھول کھلاتا ہے تو وہ یا تو بالواسطہ طور پر اس کے کسی سابقہ قصیدہ کا شکرانہ ادا کر رہا ہوتا ہے یا یہ کہتا ہے کہ تم بھی اسی طرح میرا قصیدہ شائع کرنا۔ کبھی ایک تعریف اس لئے بھی شائع کی جاتی ہے کہ کسی سابقہ تنقید کی وجہ سے اپنی بگڑی ہوئی تصویر کو متوازن کیا جا سکے۔ حقیقی تعریفی کلمات وہ ہیں جو اپنے بھائی کی خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نکلے ہوں۔ مگر یہی چیز دنیا میں سب سے زیادہ کم یاب ہے۔ کسی کو حقیقی خیر خواہی کا ایک کلمہ دینا اتنی بڑی فیاضی ہے جو شاذ و نادر ہی کسی خوش نصیب کے حصہ میں آتی ہے۔

لڑائی کے ساتھ تعمیر نہیں ہوتی

لنڈن بی جانسن (۱۹۰۸–۱۹۷۳) جان کینیڈی کے قتل کے بعد ۱۹۶۳ میں امریکہ کے صدر بنائے گئے۔ وہ امریکہ کے پہلے صدر تھے جن کو ۱۶ ملین ووٹوں کی اکثریت سے صدر چنا گیا۔ صدر جانسن کو امریکہ کے اندرونی مسائل سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کے چھ سالہ صدارت کے زمانہ میں ملک کی اندرونی اصلاح کے لئے سول رائٹس بل اور دوسرے کئی اہم قوانین پاس ہوئے۔ ان کے ذہن میں یہ پروگرام تھا کہ امریکہ کو عظیم سماج (Great Society) بنائیں۔ مگر جلد ہی وہ ویٹ نام کی جنگ میں الجھ گئے جو ان کے بعد اس طرح ختم ہوئی کہ اس نے امریکہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ کہا جاتا ہے کہ ویٹ نام کی بارہ سالہ جنگ میں امریکہ کے ۳۶۰۰ جیٹ طیارے اور ۵ ہزار ہیلی کاپٹر تباہ ہوئے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۵۰ ہزار امریکی مارے گئے اور تین لاکھ سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اسی نسبت سے دوسرے نقصانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق دور حاضر کی اس طویل ترین جنگ میں امریکہ کے تقریباً ایک سو کھرب ڈالر برباد ہوئے۔

صدر جانسن نے امریکہ کو دنیا کا عظیم ترین سماج بنانے کا خواب دیکھا تھا۔ مگر عملاً صرف یہ ہوا کہ انھوں نے امریکہ کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ دوسرے درجہ کی طاقت بننے کی طرف چل پڑا۔ مسلسل واقعات ثابت کر رہے ہیں کہ امریکہ زوال کی طرف جا رہا ہے۔ مبصرین کا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں وہ روس کے مقابلہ میں دوسرے درجہ کی طاقت بن جائے گا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ امریکہ، صدر جانسن کے زمانہ میں، ایک ایسی ہولناک جنگ میں الجھ گیا جس سے بربادی کے سوا کچھ اور ملنے والا نہ تھا۔ جب بھی آدمی کسی مقصد کو حاصل کرنے کا ارادہ کرے تو اس کے ساتھ ضروری ہے کہ وہ مقصد کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرے۔ آپ اپنے کمرہ کی دیوار کو سفید دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کے لئے لازم ہے کہ کمرہ میں کوئلہ کی انگیٹھی نہ جلائیں۔ کوئی شخص اپنی معاشی زندگی کی تعمیر کرنا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ قتل اور مقدمہ بازی جیسی چیزوں میں نہ الجھے۔ یہ اصول فرد کے لئے بھی ضروری ہے اور قوم کے لئے بھی۔

سیاست لڑنے بھڑنے کا نام نہیں ہے بلکہ اپنے کو طاقت ور بنانے کا نام ہے۔ ایک چینی کہاوت ہے کہ امن کے زمانہ میں جتنا زیادہ پسینہ بہاؤ گے، جنگ کے زمانہ میں اتنا ہی کم خون بہے گا۔ حقیقی جنگ یہ ہے کہ جنگ سے پہلے اتنی تیاری کی جائے کہ جنگ کے بغیر صرف دھمکی سے کام چل جائے اور اگر جنگ کرنی ہی پڑے تو معمولی نقصان کے بعد جنگ کا فیصلہ ہو جائے۔ کسی قوم کو ترقی یافتہ بنانے کا کام تعمیری سرگرمیوں کے ذریعہ ہوتا ہے نہ کہ جنگی اقدام سے۔

یقیناً زندگی میں اشتعال کے مواقع آتے ہیں جو آدمی کو جنگ اور مقابلہ آرائی کی طرف کھینچتے ہیں۔ مگر عقل مند وہ ہے جو ایسے موقع پر صبر و تحمل سے کام لے نہ کہ جوش میں آکر جنگ کے میدان میں کود پڑے۔ جنگ سے پہلے جنگ سے بچنا صرف جذبات کی قربانی مانگتا ہے مگر جنگ میں کودنے کے بعد جنگ کو چھوڑنے کے لئے مفاد کی قربانی دینی پڑتی ہے۔ اور پہلی چیز کے مقابلہ میں دوسری چیز یقیناً زیادہ بھاری ہے۔

اختلاف کا نقصان

پندرھویں صدی میں عرب تاجر جنوبی ہند کے ساحلی علاقوں کی تجارت پر چھائے ہوئے تھے۔ اس زمانہ میں ہندوستان اور بیرونی دنیا کے درمیان تمام بری اور بحری راستوں پر مسلمانوں کا قبضہ تھا۔ وہ ان کے ذریعہ نہایت کامیاب تجارت کر رہے تھے۔ مگر سولھویں صدی کے آغاز سے تاریخ بدلنا شروع ہوئی۔ واسکوڈی گاما (۱۴۶۰-۱۵۲۴) نے یورپ اور ہندوستان کے درمیان بحری راستہ دریافت کیا۔ اس کے بعد پرتگالی تاجروں کے قافلے اس علاقہ میں داخل ہونے لگے۔ دھیرے دھیرے انھوں نے ہندوستان کی بیشتر ساحلی تجارت پر قبضہ کر لیا اور مسلمانوں کو اپنی ہوشیاری سے اس علاقہ کی تجارت سے بے دخل کر دیا۔ اس زمانہ میں ہندوستان کے گرم مسالے بیرونی ملکوں میں بہت اچھی قیمت پر فروخت ہوتے تھے۔ پرتگالی جہاز یہاں سے سیاہ مرچ، دارچینی، لونگ، جاوتری وغیرہ قیمتی پیداوار اپنے جہازوں میں بھر بھر کر لے جانے لگے اور مسلمانوں کے پاس صرف ڈلی اور ناریل کی معمولی تجارت رہ گئی۔ مسلمان صرف انھیں چیزوں کی تجارت کر سکتے تھے جن کو پرتگالی لائق اعتنا نہ سمجھتے تھے۔ تمام اہم اور فائدہ بخش چیزوں کی تجارت پرتگالیوں نے اپنے قبضہ میں لے رکھی تھی۔ پرتگالیوں نے اپنی ہوشیاری سے ساحلی راجاؤں کو اپنا مطیع بنا کر بندرگاہوں پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح ملاکا، اشی، دناسری، وغیرہ خشکی کے راستے انھوں نے عربوں کے لئے بند کر دئے۔ حتیٰ کہ ان کے امان اور ان کے اجازت نامہ کے بغیر کوئی اس علاقہ میں بحری سفر نہیں کر سکتا تھا۔ مسلمانوں کی معمولی تجارت بھی پرتگالی جہازوں کے ذریعہ ہوتی تھی

مسلمانوں کی تجارتی کامیابیوں کے جلو میں اس علاقہ میں اسلام تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ خصوصاً ساحلی علاقے بہت بڑے پیمانہ پر اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مرکز بن گئے تھے۔ عین اس وقت اس علاقہ کی سیاست اور اقتصادیات پر پرتگالیوں کا قبضہ ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام اسلامی سرگرمیاں ٹھپ ہو گئیں۔ اسلام کی اشاعت کا کام رک گیا۔ ایک تاریخ بنتے بنتے رہ گئی۔

مسلمانوں کے اوپر پرتگالیوں کی فتح کا راز کیا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں میں نااتفاقی پھیلی ہوئی تھی۔ جب کہ پرتگالی حد درجہ اتفاق و اتحاد کے ساتھ کام کرتے تھے، سیاح زین الدین نے لکھا ہے:

"پرتگالی بڑے ہوشیار، فریبی اور اپنی مصلحت کے بڑے ماہر ہیں۔ ضرورت کے وقت اپنے دشمنوں کی خوشامد کرنے میں بھی ان کو عار نہیں ہوتا۔ ان میں بڑا اتحاد ہے۔ وہ اپنے سرداروں کے حکم سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ اپنے دارالحکومت سے دوری کے باوجود ان میں کبھی اختلاف نہیں ہوتا۔ آج تک یہ سننے میں نہیں آیا کہ انھوں نے اقتدار کے حصول کے لئے اپنے کسی بڑے آدمی کو قتل کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد کی کمی کے باوجود وہ مالابار وغیرہ کے راجاؤں کو اپنا مطیع بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کا یہ حال ہے کہ ان کی فوج اور ان کے سرداروں میں بہت اختلاف ہے۔ ان کا حصول اقتدار کا جذبہ اتنا بڑھا ہوا ہے کہ اس کی خاطر وہ باہم ایک دوسرے کو قتل کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔" (تاریخ الحضارۃ العربیہ از محمد کرد علی شامی)

اتحاد کیوں نہیں

۲۹ اگست ۱۹۶۹ کا واقعہ ہے۔ دہلی کے آزاد پارک (جامع مسجد) میں ایک ہی دن دو جلسے ہوئے۔ دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا مگر دونوں دو الگ الگ شامیانوں کے نیچے ہوئے۔ ایک جلسہ شام کو ۵ بجے ہوا، دوسرا جلسہ اسی دن اسی مقام پر ۹½ بجے شب میں۔ ایک جلسہ کو مسلمانوں کی "وطن دوست" جماعتوں نے بلایا تھا اور دوسرے جلسہ کو "اسلام دوست" جماعتوں نے۔

دونوں جلسوں کا مقصد ایک تھا۔ "مسجد اقصیٰ کی آتش زدگی کے خلاف ہندستانی مسلمانوں کے جذبات کا اظہار کرنا" دونوں جلسوں میں ہندستان کے مسلم قائدین کے ساتھ عرب سفرا بھی بلائے گئے تھے۔ راقم الحروف دونوں جلسوں میں شریک ہوا اور دونوں قسم کے مقررین کی تقریریں سنیں۔ دونوں جلسوں میں پُرجوش تقریریں ہوئیں۔ تمام مقررین کی تقریروں کا خلاصہ یہ تھا کہ اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کو اس لئے شکست ہوئی کہ وہ متحد نہیں تھے۔ انھوں نے مشورہ دیا "اے عربو، متحد ہو کر اسرائیل کا مقابلہ کرو"

میں جب دونوں جلسوں کو دیکھ کر واپس ہوا تو دل کی عجیب حالت تھی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا ——— ہم متحد ہو کر مشورہ بھی نہیں دے سکتے اور وہ متحد ہو کر مقابلہ کریں!

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ اتحاد کی باتوں کے باوجود اتحاد قائم نہیں ہوتا۔ ہمارا ہر قائد اتحاد کی باتیں کرتا ہے مگر عملاً اس کے الفاظ بالکل بے اثر ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی اپنے اس کہنے میں سنجیدہ نہیں۔ ہر آدمی اتحاد کا پیغام دینے کا کریڈٹ تو لینا چاہتا ہے مگر وہ اس کے عملی تقاضے پورا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ لوگ جو کچھ کہتے ہیں کرتے نہیں، کیونکہ وہ اس کی قیمت دینا نہیں چاہتے۔

اتحاد کی واحد لازمی قیمت اپنی بے اتحادی کو ختم کرنا ہے۔ جب تک آدمی اپنی بے اتحادی کو ختم نہ کرے اتحاد قائم نہیں ہو سکتا۔ جو آدمی اتحاد کی دعوت دے رہا ہے وہ خود بھی انھیں میں سے ایک ہے جن کے ملنے سے مطلوبہ اتحاد قائم ہو گا۔ پھر اگر وہ اپنے کو اس میں شامل نہ کرے تو اتحاد کی تکمیل کس طرح ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے کو دوسروں کے ساتھ شامل کرنے کا نام اتحاد ہے اور اپنے کو دوسرے سے الگ کرنے کا نام اختلاف۔ جہاں ہر آدمی اپنی انفرادیت پر اصرار کرے، جہاں ہر آدمی ہر کام کا کریڈٹ خود لینا چاہے وہاں اتحاد کیونکر قائم ہو گا۔

اتحاد نام ہے مجموعہ کے لئے اپنی ذات کو قربان کرنے کا۔ جو لوگ اپنی ذات یا اپنے گروہ کی قربانی پر تیار نہ ہوں وہ اگر اتحاد کے لئے پکارتے ہیں تو گویا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ لوگو میرے جھنڈے کے پیچھے جمع ہو جاؤ، لوگو میری سرداری کو قبول کرلو۔ ایسے لوگوں کے لئے زیادہ بہتر تھا کہ وہ لوگوں کو اختلاف کے لئے پکاریں، وہ انتشار کا جھنڈا بلند کریں۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ خدا کے یہاں کم از کم دو عملی کا مجرم قرار دئے جانے سے بچ سکتے تھے۔

اتحاد کی قیمت : شخصی جذبات کی قربانی

آپ کسی مسلم لیڈر سے ملئے۔ کسی مسلم ادارہ میں جائیے۔ ہر ایک آپ کو اپنے کارناموں کی لمبی فہرست بتائے گا۔ ہر جگہ آپ کو شان دار ایڈریس شاندار ترفریم میں دیواروں کی زینت بنے ہوئے دکھائی دیں گے۔ ہمارا ہر لیڈر اور ہمارا ہر ادارہ، اپنے بیان کے مطابق، عظیم الشان کارنامے انجام دے رہا ہے۔ مگر ان کارناموں کو ان کی مجموعی صورت میں دیکھنا چاہیں تو وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ افراد کی مجموعی صورت ہی کا نام اسلام یا ملّت اسلام ہے۔ مگر کیسی عجیب بات ہے کہ اسلامی افراد الگ الگ فتوحات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں مگر اسلام ساری دنیا میں مغلوب ہے۔ ملّت کے افراد الگ الگ کامیابیوں کے مینار کھڑے کر رہے ہیں مگر ملت ناکامی کی پستی میں پڑی ہوئی ہے۔ اینٹیں سونے کی ہیں مگر ان کے ملنے سے جو محل بنا ہے وہ مٹی کا ہے۔ درخت سیب کے ہیں مگر ان سے جو باغ تیار ہوا ہے وہ ببول کا خارستان ہے۔

اس عجیب وغریب تضاد کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کام کو اسلام کا کام بتایا جا رہا ہے وہ حقیقۃً اسلام کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ سب افراد کے اپنے کاروبار ہیں۔ اس لئے افراد کی سطح پر ان کے کچھ جلوے نظر آتے ہیں مگر اجتماع (اسلام) کی سطح پر ان کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا۔ لوگوں نے اپنی قیادت کے کاروبار پر ملت کا لیبل لگا رکھا ہے۔ اپنی ذاتی تجارت کو اسلام کا نام دے دیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کی سرگرمیوں کے نتائج اسلام یا ملت اسلام کی سطح پر کیوں کر نظر آئیں گے۔

ایک بڑے شہر میں ایک لاکھ کامیاب دکانیں ہیں۔ ہر دکان دار صبح شام پیسے کما رہا ہے۔ آپ جس دکان دار سے بھی ملیں، اس کے پاس اپنی کامیابیوں کی داستان بتانے کے لئے بے شمار الفاظ ہوں گے۔ تاہم اگر آپ چاہیں کہ ان ایک لاکھ دکان داروں کی کمائیاں کسی ایک مقام پر روپیوں کے پہاڑ کی صورت میں دکھائی دیں تو آپ کو بالکل ناکامی ہوگی۔ کیوں کہ ہر دکان دار جو کما رہا ہے وہ اپنی ذات کے لئے کما رہا ہے نہ کہ کسی "مجموعہ" کے لئے۔ چنانچہ ہر دکان دار کا اپنا مکان شان دار طور پر بن رہا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی میں اس کی کمائی کی چمک دمک آپ خوب دیکھ سکتے ہیں۔ مگر کسی مجموعہ کے لئے وہ کما ہی نہیں رہا ہے اس لئے مجموعہ کی سطح پر اس کی کامیابیاں نظر بھی نہیں آتیں۔ افراد کے کاروبار افراد کی سطح پر نظر آ سکتے ہیں، اجتماع کی سطح پر وہ کیوں کر دکھائی دیں گے۔ اسی سے اسلام کے معاملہ کو سمجھا جا سکتا ہے۔ افراد کا اسلامی کام اسی وقت اسلامی کام ہے جب کہ اس کا فائدہ مجموعۂ اسلام کو مل رہا ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ انفرادی کاروبار ہے خواہ اس کو کرتے ہوئے کتنا ہی زیادہ اسلام کی تلاوت کی جا رہی ہو۔ اور اس کے اوپر کتنے ہی عالی شان اسلامی بورڈ لگے ہوئے ہوں۔

جوتے اور کپڑے کی دکان آدمی اس لئے کھولتا ہے کہ اس سے اس کو نفع حاصل ہو، اسی مزاج کے تحت اگر کسی بظاہر اسلامی کام کو کیا جائے تو اس کا ظاہری طور پر اسلامی ہونا اس کو خدا کی نظر میں اسلامی نہیں بناتا۔ کیونکہ اسلام میں عمل کا دار و مدار نیت پر ہے۔ اللہ کو وہ عمل پسند ہے جو صرف اس کی رضا حاصل کرنے کے لئے کیا گیا ہو۔ پھر جس کام کو دنیوی مقاصد کے لئے کیا جائے اس پر خدا کی برکتیں کس طرح نازل ہوں گی۔

پہاڑوں پر بے شمار چھوٹے چھوٹے جھرنے جاری ہوتے ہیں۔ اپنی انفرادی حیثیت میں وہ صرف پانی کے سوت کی مانند

ہوتے ہیں۔ مگر جب قدرت ان کو ایک دھارے میں ملا دیتی ہے تو ان کا ملنا ایک بڑے دریا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کی اسلامی کوششوں کے سلسلہ میں بھی مطلوب ہے۔ "اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں جیسے کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں (صف ۴) وہی اسلامی عمل اللہ کے نزدیک اسلامی عمل ہے جس کا رخ اجتماعیت کی طرف ہو۔ جب کہ انفرادی کوششیں اس طرح جاری ہوں کہ بالآخر وہ سب کی سب مل کر ایک دریا بن جائیں۔ اس کے برعکس اگر افراد کی اسلامی کوششیں الگ الگ جھرنوں کی صورت میں بہتی رہیں اور دوسروں کی اسلامی کوششوں سے مل کر ایک بڑا دھارا نہ بنیں تو وہ خدا کے نزدیک بے قیمت ہیں۔

اگر لوگ ذاتی محرک کے تحت کام کر رہے ہوں تو ان کا اسلامی عمل انفرادی عمل بن کر رہ جاتا ہے اور اگر وہ خدا کے لئے متحرک ہوئے ہوں تو ناممکن ہے کہ ان کا عمل صرف اپنی ذات کے گرد گھومے، دوسروں کے ساتھ مل کر بڑا دھارا نہ بنے۔ لوہے کے ٹکڑے اسی وقت تک الگ الگ رہتے ہیں جب کہ ان کے درمیان کوئی مقناطیس نہ ہو۔ جب ان کے درمیان ایک مقناطیس آجائے تو لازماً وہ سب مقناطیس کے گرد جڑ کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اہل اسلام کی کوششیں اگر حقیقۃً خدا کے لئے ہو رہی ہوں تو خدا کی ذات ایک عظیم مقناطیس بن جاتی ہے جو تمام کوششوں کو ایک نقطہ کے گرد سمیٹ دیتی ہے۔ اہل اسلام کی کوششوں کا انتشار اس وقت ہوتا ہے جب کہ وہ خدا کے لئے نہ ہو بلکہ اپنی ذات کے لئے ہو۔

اجتماعی کام کے لئے جب کچھ لوگ ساتھ ہوتے ہیں تو طرح طرح کی ناموافق باتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مزاجوں کا اختلاف دل شکنی کا باعث ہوتا ہے۔ کبھی کسی کی تنقید سے خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ کبھی ایک شخص کی کمزوری سے دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کبھی ضرورت ہوتی ہے کہ سنانے کے شوق کو دبا کر سننے کے لئے اپنے کو آمادہ کیا جائے۔ کبھی تقاضا ہوتا ہے کہ دوسرے کی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے آپ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کے لئے راضی کیا جائے۔ غرض بار بار ایسے مواقع سامنے آتے ہیں جہاں اپنی انفرادیت کو کچلنے کا سوال ہوتا ہے۔ یہی مواقع آدمی کے جذبہ اتحاد کا امتحان ہوتے ہیں۔

کوئی بڑا اسلامی کام صرف وہ لوگ کرتے ہیں جن کے اندر اتنی بلندی ہو کہ وہ مفاد اور مصلحت کے بغیر جڑ سکتے ہوں۔ وہ اس وقت بھی اپنے بھائی کی قدر کریں جب کہ اس سے ان کی ذات کو خوشامد کی غذا نہ مل رہی ہو۔ وہ اپنے بھائی کے اوپر خرچ کریں مگر ان کے اندر اپنے بڑے ہونے کا احساس نہ پیدا ہو۔ وہ اپنے بھائی کی کمزوری کو دیکھیں مگر اس کو نمایاں کرنے کا جذبہ ان کے اندر نہ ابھرے۔ وہ دوسرے کی زبان سے اپنے بارے میں کڑوی بات سنیں مگر ان کے دل میں دوسرے کے لئے نفرت کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ دوسرے کی طرف سے ان کے مزاج کے خلاف رویہ ظاہر ہو مگر اس کو وہ دوسرے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی بنیاد نہ بنائیں۔ دوسرے کی ذات سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو پھر بھی وہ خدا کے لئے اس سے محبت کریں —— اسی کا نام "صبر" ہے۔ اور اسی قسم کے صبر والے لوگ کوئی بڑا دینی کام کرتے ہیں اور انھیں لوگوں کے ملنے سے وہ چیز وجود میں آتی ہے جس کا نام اسلامی اتحاد ہے۔

اتحاد کے لئے سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ شخصی قربانی ہے۔ جس گروہ کے افراد میں یہ طاقت ہو کہ وہ اپنے شخصی تقاضوں کو اجتماع کی خاطر دبا سکیں، ان میں اتحاد قائم ہو کر رہتا ہے، اور وہی ہیں جو کوئی بڑا کام کرتے ہیں۔

شدت کا سبب سیاست

سیاسی اختلاف ہمیشہ شدت پیدا کرتا ہے۔ قدریہ اور جبریہ فرقوں میں جو شدت نظر آتی ہے اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ دونوں فرقے سیاسی اسباب کے تحت پیدا ہوئے۔ خلافت راشدہ کے آخری دور میں سیاسی اقتدار بنو ہاشم کے ہاتھ میں تھا۔ بنو امیہ نے ان سے اقتدار چھین لیا۔ بنو ہاشم کی طرف سے کسی متوقع بغاوت کو کچلنے کے لئے انھوں نے ان کے اوپر سخت مظالم کئے۔ یہی وقت ہے جب کہ جبر و اختیار کے نظریات، مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ بنو امیہ نے اپنی سیاست کی نظریاتی توجیہہ کے لئے جبر کا سہارا لیا۔ انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اس لئے بنو امیہ کا بنو ہاشم سے خلافت چھیننا اور ان کے افراد پر سختیاں کرنا سب خدا کی مرضی کے مطابق ہے۔ جو ہونا تھا وہی ہو رہا ہے، اس میں کسی انسان کی مرضی کا کوئی دخل نہیں۔ اس کے جواب میں ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے دوسرے گروہ نے کہا کہ انسان آزاد ہے اور خود اپنی مرضی سے اپنے لئے کوئی راہ منتخب کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اس طرح نظریۂ اختیار کا مطلب، اس وقت کی فضا میں یہ ہو گیا کہ بنو امیہ ظالم ہیں۔ کیوں کہ انھوں نے جو کچھ کیا ہے اپنے ارادہ سے کیا ہے خدا کے حکم کا اس سے کوئی تعلق نہیں ——— کوئی بحث اگر خالص علمی مقصد کے تحت نہ ہو بلکہ اس کے پیچھے دوسرے مفادات و محرکات کام کر رہے ہوں تو دونوں فریقوں کی طرف سے شدت اور مبالغہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی قدریہ اور جبریہ کے ساتھ ہوا۔ قدیم کتابوں میں ان مباحث پر جو شدت پائی جاتی ہے وہ اسی سیاسی پس منظر کا نتیجہ ہے۔

یہی معاملہ دوسرے عنوان کے ساتھ خوارج کا تھا جنھوں نے ایمان و عمل کے بارے میں انتہا پسندانہ اعتقادی مباحث پیدا کئے۔ خوارج نے بنو امیہ کے خلاف بغاوت کا فتویٰ دیا۔ چوں کہ اسلام میں مسلمانوں کی قائم شدہ حکومت کے خلاف جنگ کو ناجائز قرار دیا گیا ہے، انھیں اپنے اقدام کے لئے ایک نظریاتی جواز درکار تھا۔ اس مقصد کے لئے انھوں نے ایمان و عمل کے مسئلہ کا سہارا لیا۔ انھوں نے ایمان کی ایسی تعریف پر اصرار کیا جس میں عمل بھی لازمی طور پر داخل ہو، صرف ایمان کسی کو مسلمان قرار دینے کے لئے کافی نہ ہو۔ تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ وقت کے حکمراں مسلمان نہیں ہیں اور ان کے خلاف خروج کرنا جائز ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسری جانب کے لوگوں نے جوابی شدت اختیار کی۔ انھوں نے اس پر زور دیا کہ صرف ایمان کسی کے مسلمان ہونے کے لئے کافی ہے، اس کے لئے عمل لازمی شرط نہیں ہے۔ پہلے نظریہ کی صورت میں وقت کے حکمرانوں کے خلاف بغاوت جائز قرار پاتی تھی، دوسرے نظریہ کی صورت میں ان کے خلاف بغاوت کرنا حرام تھا۔ یہی سیاسی پس منظر تھا جس کی وجہ سے ایمان و عمل کی بحث نے وہ شدت اختیار کی جو ہم کو قدیم کتابوں میں دکھائی دیتی ہے۔

سیاسی اسباب کے تحت جو نظریہ پیدا ہو اس میں شدت کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ طلاق المکرہ لیس بشئی کا فتویٰ اور قرآن کو غیر مخلوق کہنا حکومت کی نظر میں اس لئے سنگین بن گئے کہ وقت کے حالات نے ان میں سیاسی پہلو پیدا کر دیا تھا۔

اُردو

تذکیر القرآن

اللہ اکبر
پیغمبر انقلاب
مذہب اور جدید چیلنج
عظمتِ قرآن
عظمتِ اسلام
عظمتِ صحابہ
دین کامل
الاسلام
ظہورِ اسلام
اسلامی زندگی
احیاء اسلام
رازِ حیات
صراط مستقیم
خاتونِ اسلام
سوشلزم اور اسلام
اسلام اور عصر حاضر
الربانیہ
کاروانِ ملت
حقیقتِ حج
اسلامی تعلیمات
اسلام دورِ جدید کا خالق
حدیثِ رسولؐ
سفرنامہ (غیر ملکی اسفار)
سفرنامہ (ملکی اسفار)
میوات کا سفر
قیادت نامہ
راہِ عمل
تعبیر کی غلطی
دین کی سیاسی تعبیر
عظمتِ مومن
اسلام ایک عظیم جدوجہد
منزل کی طرف
فکر اسلامی
طلاق اسلام میں
دین انسانیت

شتم رسولؐ کا مسئلہ
مطالعۂ سیرت
ڈائری جلد دوم
کتابِ زندگی
اقوالِ حکمت
اقوالِ حکمت
تعمیر کی طرف
تبلیغی تحریک
تجدید دین
عقلیات اسلام
مذہب اور سائنس
قرآن کا مطلوب انسان
دین کیا ہے
اسلام دین فطرت
تعمیر ملت
تاریخ کا سبق
فسادات کا مسئلہ
انسان اپنے آپ کو پہچان
تعارفِ اسلام
اسلام پندرھویں صدی میں
راہیں بند نہیں
ایمانی طاقت
اتحادِ ملت
سبق آموز واقعات
زلزلۂ قیامت
حقیقت کی تلاش
پیغمبرِ اسلامؐ
آخری سفر
اسلامی دعوت
خدا اور انسان
حل یہاں ہے
سچا راستہ
دینی تعلیم
امہات المومنین
تصویرِ ملت
دعوتِ اسلام
دعوتِ حق
نشری تقریریں

اسفارِ ہند
اسلام ایک تعارف
حیاتِ طیبہ
باغِ جنت
نارِ جہنم
تبلیغی ڈائری
رہنمائے حیات
مضامین اسلام
تعددِ ازدواج
ہندستانی مسلمان
روشن مستقبل
صومِ رمضان
علمِ کلام
اسلام کا تعارف
علماء اور دورِ جدید
سیرتِ رسولؐ
ہندستان آزادی کے بعد
مارکسزم تاریخ جس کو
رد کر چکی ہے
سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ
الاسلام یتحدی (عربی)
یکساں سول کوڈ
اسلام کیا ہے

ھندی

سچائی کی تلاش
انسان اپنے آپ کو پہچان
پیغمبرِ اسلامؐ
سچائی کی کھوج
آخری سفر
اسلام کا پریچے
پیغمبرِ اسلام کے مہان ساتھی
راستے بند نہیں
جنت کا باغ
بہو پتنی واد اور اسلام
اتہاس کا سبق
اسلام ایک سوابھاوک دھرم
اجول بھوشیہ
پوتر جیون

A Treasury of the Qur'an
Words of the Prophet Muhammad
Muhammad: A Prophet for All Humanity
An Islamic Treasury of Virtues
The Life of the Prophet Muhammad
Sayings of Muhammad
The Beautiful Commands of Allah
The Beautiful Promises of Allah
The Soul of the Qur'an
The Wonderful Universe of Allah
Presenting the Qur'an
The Muslim Prayer Companion
Indian Muslims
Islam and Modern Challenges
Islam The Voice of Human Nature
Islam Creator of the Modern Age
Woman Between Islam and Western Society
Woman in Islamic Shari'ah
Islam As It Is
Religion and Science
The Way to Find God
The Teachings of Islam
The Good Life
The Garden of Paradise
The Fire of Hell
Man Know Thyself
Muhammad The Ideal Character
Tabligh Movement
Polygamy and Islam
Hijab in Islam
Concerning Divorce
Uniform Civil Code